41

مرتبہ
مالک رام

علمی مجلس دلی کا تماہی رسالہ

(۴۱)

مرتّب : مالک رام

جلد ۱۱ جولائی / ستمبر ۱۹۷۷ء شمارہ ۳

ضیا فتح آبادی نمبر

چندہ سالانہ : ہندستان پندرہ روپے اس شمارے کی قیمت پندرہ روپے

غیر ممالک : تین پونڈ (انگریزی) ، ۸ ڈالر (امریکی)

پرنٹر و پبلشر ظلّ عبّاس عبّاسی نے جمال پرنٹنگ پریس، دلّی میں چھپوا کر علمی مجلس ۱۴۲۹ چھتّہ نواب صاحب، فراشخانہ، دلی ۶ سے شائع کیا

ملاحظات

حسبِ وعدہ ہم "تحریر" کا یہ شمارہ خاص نمبر کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ اس میں جناب مہر لال سونی ضیا فتح آبادی کی شخصیت اور شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ ہم نے شروع سے یہ لائحۂ عمل مدِ نظر رکھا کہ زندہ ادیبوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا جائے۔ اردو کا ماحول بیشتر مردہ پرست رہا ہے؛ ہم ہنوز اپنے معاصروں کو ان کا حق ادا کرنے میں بخل سے احتراز نہیں کر سکے۔ یہ نہ صرف معاصر ادیب سے ناانصافی ہے، بلکہ ہماری اپنی کوتاہ فہمی کا بھی کھلا ثبوت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رویّہ ادب کی ترقی کے رستے کا روڑا ثابت ہو سکتا ہے! اور ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک، زبان کے ہر بہی خواہ کو اس سے اجتناب لازم ہے۔ وما توفیقنا الا باللہ العظیم۔

یہ پرچہ مجبوراً کچھ تاخیر سے شائع ہو رہا ہے، جس کے لیے ہم معافی کے خواستگار ہیں۔ اس کے بعد کا سال رواں کا آخری شمارہ بھی بالکل تیار ہے، اور اس کے متعاقب حاضرِ خدمت ہو رہا ہے۔

مالک رام

سلسلۂ مطبوعات علمی مجلس، دلّی: ۲۷

ضیا فتح آبادی

شخص اور شاعر

مرتّبہ

مالک رام

علمی مجلس، دلّی

۱۹۷۷ء

ضیا فتح آبادی: شخص اور شاعر

مرتب : مالک رام

مطبع : جمال پرنٹنگ پریس، دلّی

اشاعت: ستمبر ۱۹۷۷ء

تقسیم کار: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، نئی دلّی، دلّی، بمبئی، علی گڑھ

قیمت : پندرہ روپے

HaSnain Sialvi

فہرست

جوش ملیح آبادی

مہرلال ضیا فتح آبادی

(۱)

حضرت ضیا میرے قدیم احباب میں سے ہیں۔ ان کی شخصیت و شاعری سے میں ہمیشہ مانوس رہا ہوں۔

ان کی شاعری میں سنجیدگی ہے، ان کے طرزِ بیان میں رس اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ یہ عام شعرا کے مانند ردیف اور قافیے کے حدود میں رہ کر، روایتی شاعری سے ہمیشہ دامن بچاتے اور عروسِ شعر کو اپنی تخیئل کے زیوروں سے سجاتے ہیں۔

یہ بڑی بدبختی ہے کہ ضیا صاحب بینک کے دامنِ خشک سے وابستہ ہیں، جہاں روپے، آنے، پائی کے حسابات سے دماغ کو فرصت نہیں ملتی۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر قدرت ان کو اس قدر مضبوط دل و دماغ عطا نہ فرماتی، تو وہ ناموزوں ہو کر رہ جاتے۔ یہ دراصل ایک معجزہ ہے کہ وہ اس جھلسا دینے والے ماحول میں رہ کر نسیم و شمیم سے کھیلتے رہتے ہیں۔

میری دلی تمنا ہے کہ اربابِ ذوق ان کے مرتبۂ سخن کو سراہیں اور ان کی شاعری کو سر آنکھوں پر بٹھائیں۔

جوش

۲۴ مئی ۱۹۶۵ء دہلی تمریف

(۲)

مہرلال صاحب ضیا، میرے قدیم احباب میں سے ہیں، یعنی اتنے پرانے دوست ہیں کہ اگر کوئی

اتنا پرانا دشمن بھی مل جائے، تو اس کو کلیجے سے لگا لینا چاہیے۔

رہی ضیا صاحب کی شاعری، سو اس کے بارے میں صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ ان کے کلام میں خوشگوار سنجیدگی، لوچ اور رس پایا جاتا ہے، وہ اس قدر دلنشین ہوتا ہے کہ روح وجد کرنے لگتی ہے۔

میری دلی تمنا ہے کہ ان کے کلام کی ارباب ادب و علم قدر کریں اور اسے سر آنکھوں پر جگہ دیں!

مرحوم جوش

مالک رام

ضیا فتح آبادی
(مختصر سوانح حیات)

پنجاب میں امرتسر پٹی ریلوے لائن پر ترن تارن اسٹیشن سے تقریباً ۱۵ کیلومیٹر کے فاصلے پر گوئند وال کے راستے میں ایک خاصا بڑا قصبہ فتح آباد ہے۔ یہی قصبہ مہر لال سونی ضیا فتح آبادی کے بزرگوں کا وطن ہے، اور اسی سے وہ خود کو منسوب کرتے ہیں۔ اس کی تحقیق تو نہیں ہو سکی کہ یہ خاندان فتح آباد میں کب سے آباد ہے، لیکن موجودہ معلومات کی رُو سے یہ متحقق ہے کہ ۱۷۷۳ء میں ان کے مورثِ اعلیٰ لالہ باول داس کے پوتے لالہ تن سکھ رائے وہاں موجود تھے۔ ممکن ہے کہ بعض افراد نے ملازمت بھی کی ہو، لیکن عام طور پر ساہوکارہ اور زمینداری بسر اوقات کا ذریعہ تھے؛ ضرورتمند اصحاب کو سُود پر قرض دیا جاتا اور یہی سُود کی آمدنی خاندان کے اُجلے خرچ کے لیے کفایت کرتی۔

لالہ باول داس کی ساتویں پشت میں ایک صاحب تھے لالہ تارا چند؛ یہ ضیا کے دادا تھے۔ انھوں نے ساہوکارہ کے ساتھ بزازی کی دکان بھی کر لی تھی۔ ان کا ۱۹۴۷ء میں انتقال ہوا۔ ان کی اولاد میں دو بیٹے، لالہ منشی رام اور لالہ درگا داس، اور ایک بیٹی اننتی ہوئے۔ یہی بڑے بھائی لالہ منشی رام، ضیا کے والدِ بزرگوار تھے۔

لالہ منشی رام پیشے کے لحاظ سے سول انجینیر تھے۔ مغربی پنجاب (پاکستان) کے ضلع گجرات میں رسول کے مقام پر مشہور انجینیرنگ اسکول تھا (غالباً اب بھی ہوگا) یہاں سے دو سالہ

پورا کرنے پر اوورسیر کی سند ملتی تھی۔ اس اسکول کے فارغ التحصیل اصحاب محکمہ انہار اور حکومت وقت کے دوسرے دفتروں مثلاً پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ وغیرہ میں ملازم ہو جایا کرتے تھے۔ لالہ منشی رام بھی ۱۹۰۹ء میں اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔ اس سلسلے میں وہ مختلف مقامات پر کام کرتے رہے۔ میانوالی (۱۹۰۹ء۔۱۹۱۴ء)، الور (۱۹۱۵۔۱۹۱۶ء)، پشاور چھاونی (۱۹۱۷۔۱۹۲۲ء) جیپور (۱۹۲۴۔۱۹۲۷ء) وغیرہ پشاور چھاونی کی ملازمت کے زمانے میں وہ کابل بھی گئے، جہاں چھ مہینے تک قیام رہا۔ لیکن وہ عجیب من موجی آدمی تھے۔ طبیعت میں سیمابیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی جب جی چاہا، نوکری کا جوا اتار پھینکا، اور آزادانہ زندگی بسر کرنے لگے آج یہاں کل وہاں۔ جہاں جی چاہا، نوکری کرلی جب کہیں سے دل اچاٹ ہو گیا، استعفیٰ داخل کر دیا اور کسی اور شہر کی راہ لی۔ کچھ دن جوگندر نگر کے بن بجلی کے کارخانے میں بھی کام کیا، دیوبند اور سکھوتی ٹانڈہ کی شوگر فیکٹری میں بھی ملازم رہے۔ ان کا ۱۹۶۸ء میں انتقال ہوا۔

لالہ منشی رام کی شادی کپورتھلہ کے لالہ مول راج پوری کی منجھلی صاحبزادی شنکر دیوی سے ہوئی تھی۔ کپورتھلہ کے پوری خاندان کا پنجاب کے سربرآوردہ گھرانوں میں شمار ہوتا ہے مشہور دیوانی وکیل رائے بہادر بدری داس پوری اور دیوان بہادر کانشی رام پوری، دونوں بھائی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے، یہ دونوں لالہ مول راج پوری کے حقیقی بڑے بھائی لالہ میگھ راج کی اولاد تھے۔ خود لالہ منشی رام کے بڑے چچا لالہ گردھاری لال کے بیٹے رائے صاحب لالہ گنگا رام ڈسٹرکٹ اور سیشن جج کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے

لالہ مول راج بھی سرکاری ملازم تھے۔ وہ اولاً نائب تحصیلدار مقرر ہوئے اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے مرتبے تک پہنچے، جو اس عہد میں بڑا قابل قدر عہدہ خیال کیا جاتا تھا۔ اس صدی کے آغاز میں وہ یہیں دلّی میں افسر مال کی حیثیت سے تعینات رہے تھے۔

لالہ منشی رام کے تین بیٹیاں اور چار بیٹے ہوئے۔ مہر لال ضیا بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں۔ ان سے چھوٹے لڑکے کا صغر سنی میں جل جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ ان سے دو چھوٹے

بھائی گجندر لال (ولادت : ۱۹۲۰ء) اور سریندر لال (ولادت : ۱۹۲۲ء) بفضلہٖ زندہ وسلامت موجود ہیں۔ بہنیں تینوں ان سے بڑی تھیں۔ ان میں سے دو کا انتقال ہو چکا ہے۔ تیسری (شریمتی جانکی دیوی) اپنے گھر بار والی اور خوش و خرّم ہیں۔

مہر لال سونی ۹ فروری ۱۹۱۳ء اپنی ننھیال کپور تھلے میں پیدا ہوئے۔ جب سن شعور کو پہنچے اور تعلیم کے آغاز کا زمانہ آیا، تو اس وقت ان کے والد لالہ منشی رام پشاور چھاؤنی میں تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں انھیں مقامی خالصہ مڈل اسکول میں داخلہ ملا؛ پرائمری کے درجوں کی تعلیم اسی اسکول میں پائی۔ ۱۹۲۴ء میں والد نے جے پور کی راہ لی، تو انھیں بھی خاندان کے ساتھ وہاں جانا پڑا۔ پرائمری تک کی پڑھائی پشاور میں ہو چکی تھی جے پور میں مہاراجا ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اور اگلے چار سال لالہ منشی رام نے جم کر جے پور میں گزارے۔ یہ نویں کا امتحان پاس کر چکے تھے کہ انھوں نے جے پور سے امرتسر جانے کی ٹھان لی۔ مہر لال کے لیے امرتسر جانے سے ایک سال کا نقصان تھا، اس لیے یہ جے پور ہی میں رہے۔ ایک کمرہ کرایے پر لے لیا اور نوکر کے ساتھ رہنے لگے۔ دسویں کی سند ۱۹۲۹ء میں جے پور ہی سے حاصل کی۔

آگے اعلیٰ تعلیم کے لیے انھیں لامحالہ کسی بڑے شہر جانا تھا۔ بہت حیص بیص کے بعد قرعۂ فال ہندو سبھا کالج، امرتسر کے نام پڑا اور یہ وہاں انٹر کے درجے میں داخل ہو گئے۔ انٹر کا امتحان ۱۹۳۱ء میں پاس کرنے کے بعد فورمین کرسچین کالج، لاہور چلے گئے، جہاں سے ۱۹۳۳ء میں بی اے (فارسی آنرز) اور ۱۹۳۵ء میں ایم اے (انگریزی) کی اسناد حاصل کیں۔

اب کسبِ معاش کا مرحلہ پیش آیا۔ اپنے کامیاب تعلیمی دور کے باعث اس میں چنداں دشواری نہیں ہوئی۔ جنوری ۱۹۳۶ء میں انھیں ریزرو بنک میں کلرک کی جگہ مل گئی۔ ۱۹۵۲ء تک بنک کے دلّی دفتر میں کام کیا۔ اس دوران میں ترقی کے مدارج بھی طے کرتے رہے اور سپرنٹنڈنٹ بن گئے۔ ۱۹۵۲ء میں ان کا تبادلہ بنکنگ افسر کی حیثیت سے بنک کے مدراس دفتر میں ہو گیا۔ وہاں سے سات سالہ قیام کے بعد ۱۹۵۹ء میں واپس دلّی آئے۔ ۱۹۶۶ء میں اسسٹنٹ چیف افسر مقرر ہو کر بنک کے مرکزی دفتر بمبئی بھیج دیے گئے؛ تین برس بعد اسی اسامی پر پھر دلّی آ گئے (۱۹۶۹ء) یہاں کچھ دن ڈپٹی چیف افسر کے عہدے پر بھی کام

کیا، اور بالآخر ۱۹۷۱ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔

بحمدہٖ تعالیٰ ملازمت کا پورا زمانہ نیکنامی اور عزت و وقار سے گزرا۔ جہاں رہے، اپنی دیانتداری، فرض شناسی اور کارکردگی کے باعث افسرانِ اعلیٰ اور ہمکاروں کے حلقے میں قدر و احترام کی نظر سے دیکھے گئے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ابھی اسکول کے درجوں میں زیرِ تعلیم تھے، جب انھیں شاعری کی طرف توجہ ہوئی۔ ان کے والد لالہ منشی رام کو موسیقی کا بہت شوق تھا؛ وہ خود بھی گانے بجانے میں اچھے خاصے تھے۔ اسی باعث آئے دن گھر پر موسیقی کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ یہ ضیا صاحب کی کمسنی کا اثر پذیر زمانہ تھا؛ ان روز مرہ کی رنگین محفلوں سے ان کا متاثر ہونا قدرتی امر تھا۔ شہر میں تھیٹریکل کمپنیوں کے پھیرے بھی ہر سال ہوتے تھے۔ لالہ منشی رام کو مفت داخلے کا پاس مل جاتا، پھر لال بھی والد کے ہمراہ ناٹک دیکھنے جاتے۔ فارغ اوقات میں ان گانوں کے مصرعے گنگنانے، جو انھوں نے گھر پر یا تھیٹر میں سنے تھے۔ اس سے رفتہ رفتہ خود شعر کہنے تک نوبت پہنچ گئی۔

جے پور کی تعلیم کے زمانے میں انھیں گھر پر اردو پڑھانے کے لیے ایک استاد رکھے گئے تھے، مولوی اصغر علی ان کا نام تھا۔ وہ شاعر بھی تھے، حیا تخلص تھا۔ انھیں دنوں ضیا بھی شعر کہنے لگے، تو انھوں نے حیا صاحب سے مشورے کی درخواست کی۔ مولوی اصغر علی نے بخوشی اصلاح دینا منظور کرلیا، اور انھیں عطا تخلص دیا، چنانچہ یہ بہت دن تک عطا تخلص ہی سے لکھتے رہے۔

جب ہندو سبھا کالج، امرتسر پہنچے، تو یہاں ان کی اپنی ننھیال کپور تھلہ کے ہومیو پیتھک ڈاکٹر شفاعت احمد تسلیم سے ملاقات ہوئی، جو ان کے خاندان کے خصوصی معالج تھے۔ ان ایام میں یہاں امرناتھ محسن کے دہاں ہفتہ واری طرحی مشاعرہ ہوتا تھا، جس میں مقامی شعرا جمع ہوتے، اور اپنا کلام سناتے تھے۔ تسلیم بھی ان مشاعروں میں جایا کرتے تھے۔ ضیا بھی ان کے

ساتھ جانے لگے ۔ پھر ڈاکٹر تسنیم ہی کے ذریعے سے ان کا غلام قادر فرخ سے تعارف ہوا۔ فرخ اپنے زمانے میں نشہ بندی کے پُرجوش حامی اور پرچارک رہے ہیں، مدتوں ٹمپرنس میگزین ان کی زیر صدارت شائع ہوتا رہا۔ ضیا صاحب نے باقاعدہ فرخ کی شاگردی اختیار کر لی ۔ فرخ ہی نے ان کا تخلص عطا سے ضیا کیا ۔

یہی زمانہ ہے، جب پنجابی کے مشہور شاعر مولا بخش کشتہ کے صاحبزادے محمد افضل اور پورن سنگھ ہنر نے مل کر امرتسر سے "ماہنامہ "چمن" جاری کیا ۔ بعد کو دونوں میں لڑائی ہو گئی ۔ "چمن" ہنر نے لے لیا، اور افضل نے اپنا الگ پرچہ "چمنستان" جاری کر دیا۔ بہر حال، کہنے کی بات یہ ہے کہ ضیا کی پہلی غزل "چمن" (مارچ ۱۹۲۹ء) میں چھپی تھی، اس کا مطلع تھا،

کیا ٹھہر سکتا فروغ روے جاناں دیکھ کر
ہو گیا زرد پوش آخر مہر تاباں دیکھ کر

امرتسر کے دوران قیام میں ضیا نے تسنیم کے کہنے پر چند غزلیں حکیم فیروزالدین فروز طغرائی (ف: فروری ۱۹۳۱ء) کو بھی دکھائی تھیں، لیکن مستقل تعلق فرخ ہی سے قائم رہا ۔

ضیا کی والدہ اکثر بیمار رہتی تھیں۔ انھیں درد گردہ کی مزمن شکایت تھی ایک مرتبہ ڈاکٹر نے نسخے میں مارفیا لکھ دیا۔ اس سے انھیں بہت افاقہ ہوا۔ اس کے بعد جب کبھی ان پر درد کا دورہ پڑتا، وہ مارفیا کے لیے اصرار کرتیں ۔ رفتہ رفتہ وہ مارفیا کی عادی ہو گئیں ۔ اور جب مارفیا کسی مقامی دوا فروش کے ہاں دستیاب نہ ہوتا، تو اس کے حصول کے لیے ضیا کو لاہور جانا پڑتا؛ یہ وہاں سے ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ دکھا کر ٹیکے کی شیشیاں لے آتے ٹیکا ان کی والدہ خود ہی لگا لیا کرتی تھیں ۔ ان کا ۱۹۴۹ء میں دلی میں انتقال ہوا ۔

ایک مرتبہ ضیا لاہور ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل رہے تھے کہ ان کی نظر سڑک کے کنارے پڑے مختلف رسالوں، اخباروں کے ڈھیر پر پڑی، جو کوئی شخص بیچ رہا تھا۔

یہ رُک گئے اور پرچوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ ان میں ماہنامہ "شاعر" (آگرہ) بھی تھا جو سیماب اکبر آبادی مرحوم (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس میں بعض شاعروں کے نام کے ساتھ سیمابی کی نسبت بھی چھپی تھی؛ سیماب مرحوم کے بیشتر شاگرد اپنے نام کے ساتھ سیمابی لکھا کرتے تھے۔ ضیا صاحب، فرخ کی اصلاح سے چنداں مطمئن نہیں تھے۔ اب جو انھوں نے "شاعر" اور اس میں متعدد "سیمابیوں" کے نام دیکھے، تو فوراً طے کر لیا کہ ان کا تلمذ اختیار کر لیا جائے۔ چنانچہ امرتسر واپس پہنچ کر انھوں نے سیماب مرحوم کی خدمت میں آگرے خط لکھا کہ میں فرخ کا شاگرد ہوں، لیکن چاہتا ہوں کہ آپ کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو جاؤں۔ سیماب صاحب کا جواب ملا کہ اگر آپ کے لیے فرخ کا تعلق منقطع کرنا ناگزیر ہو، تو مجھے آپ کے کلام پر اصلاح کی ذمہ داری قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں۔ چنانچہ اس کے بعد یہ اپنا کلام بغرضِ اصلاح حضرت سیماب کی خدمت میں بھیجنے لگے۔ یہ ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔ ۱۹۴۰ء میں استاد نے انھیں فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔

اب تک ان کے مندرجۂ ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

۱۔ طلوع (میرٹھ ۱۹۳۴ء) اس میں ۵۶ قطعات ہیں۔ تعارف از ساغر نظامی

۲۔ نورِ مشرق (دلّی ۱۹۳۷ء)۔ ۴۴ نظمیں اور ۷ گیت؛ آخر میں ۹ سانیٹ ہیں۔ اس کے شروع میں جوش ملیح آبادی اور آزاد انصاری اور منظر صدیقی کے تعارف شامل ہیں۔

۳۔ ضیا کے سو شعر (یکم اکتوبر ۱۹۳۸ء)

۴۔ نئی صبح (دلّی ۱۹۵۲ء) درسی کتب کے سائز پر ۱۷۰ صفحات ہیں: ۸۴ رباعیات اور قطعات، اور ۲۶ غزلیں۔ آخر میں ۲۹ پابند اور آزاد نظمیں ہیں۔

۵۔ گردِ راہ (دلی ۱۹۶۳ء) رباعیات، نظمیں، گیت اور غزلیں۔ شروع میں ابوالحسنی گنّوری کا ایک مضمون اور خوشتر گرامی کا تعارف ہے۔

۶۔ حسنِ غزل (انبالہ ۱۹۶۶ء) غزلیات

۷۔ دھوپ اور چاندنی (لندن ۱۹۷۶ء) کلامِ شاعر، بقلمِ شاعر۔ اس میں ۵۰ غزلیں خود ضیا صاحب کے قلم سے لکھی ہوئی عکس سے شائع ہوئی ہیں۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا، جس میں ۱۰۰ غزلیں ہیں۔

ضیا کی تربیت کلاسیکی ماحول میں ہوئی تھی۔ اس پر جو اُستاد ملے، وہ بھی کلاسیکی انداز میں پختہ تھے۔ لہٰذا ان کا روایت کا پابند ہونا اور زبان و بیان کی صحت پر قدم قدم نقطۂ نگاہ سے نظر رکھنا چنداں باعثِ تعجب نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ عصری تحریکوں سے بھی بے تعلق نہیں رہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے استاد سیماب خود نئے نئے تجربوں کی حوصلہ افزائی کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے حیرت ہوتی ہے کہ داغ کا شاگرد ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے پیچھے کتنا متنوع ذخیرہ کلام چھوڑا ہے۔ ضیا کے ہاں بھی نظم اور رباعی، گیت اور سانیٹ ہر طرح کے تجربے وافر مقدار میں ملتے ہیں۔ اور وہ ہر جگہ کامیاب رہے ہیں۔ ان کی غزل میں وہ پسردگی اور رقّادگی نہیں ملتی، جو میر کا طرۂ امتیاز ہے (اور جو بعض کے نزدیک غزل کی امتیازی خصوصیت ہے) بلکہ اس کے مقابلے میں ان کے ہاں مردانہ پن، شکوہ اور خودداری کا جذبہ ہے، جو میر کے بعد کے شعرا خصوصاً عصرِ حاضر کے بعض شعرا (یگانہ، جگر وغیرہ) کا مابہ الامتیاز ہے۔ ضیا کی طبیعت ہمہ جہتی ہے۔ انھوں نے غزل کے علاوہ نظم اور رباعی اور قطعہ کے میدان میں جو کامیابی حاصل کی ہے، وہ خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔

ضیا صاحب کی اہلی زندگی ماشاء اللہ بہت خوشگوار اور پُرمسرت اور مثالی رہی ہے۔ ان کی پہلی شادی ۱۹۳۸ء میں موگا (ضلع فیروزپور) کے لالہ خوشی رام کی صاحبزادی سنیہ لتا سے ہوئی۔ لالہ خوشی رام پیشے کے لحاظ سے مدرس تھے۔ ۱۹۴۰ء میں لڑکا پیدا ہوا، افسوس کہ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہا، اور اس کی موت کے بعد اسی سال بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔

دو سال بعد دوسری شادی ہوئی؛ یہ لالہ مرلی رام کی بیٹی راج کماری ہیں۔ لالہ مرلی رام

سشن کورٹ، لاہور میں ملازم تھے۔ شریمتی راجکماری صحیح معنوں میں ضیا صاحب کی رفیق حیات ثابت ہوئیں۔ انھوں نے تمام خانگی خرخشے اور فرائض اپنے ذمے کر لیے اور ضیا صاحب کو یکسوئی سے اپنی منصبی ذمہ داریوں کی بجاآوری اور ادبی سرگرمیوں میں انہماک کے لیے آزاد کر دیا۔ غریب ہندوستانی بیوی کو کبھی اپنی قربانیوں کی کماحقہ، داد نہیں ملی شریمتی راجکماری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ضیا کی کامیابی میں اُن کی کامیاب اور پُر سکون اہلی زندگی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان سے چھ لڑکے ہیں جو اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔

اوم پرکاش بجاج

ضیاؔ فتح آبادی
شخصیّت اور فن

آج سے کوئی ۳۵ برس پہلے مجھے بسلسلۂ ملازمت دلی آنا پڑا۔ میں جولائی ۱۹۴۲ء میں یہاں آیا تھا۔ جولائی اور اگست ۱۹۴۲ء کے دو مہینے یہاں گذرے اور اس کے بعد شملے تبادلہ ہو گیا۔ اگلے تین برس شملے کی خوشگوار گرمیوں اور یخ بستہ سردیوں میں بسر ہوئے۔ روزگار کا سلسلہ تو تھا ہی۔ لیکن میرے ادبی ذوق کی نشوونما بھی یہیں شملے کی شعر انگیز اور رنگین فضاؤں میں ہوئی۔ یہاں کی بزمِ اردو کے جلسوں اور شاعروں میں بیسیوں شاعروں اور ادیبوں سے روابط پیدا ہوئے۔ بعض سے عارضی، جو تھوڑے دن بعد کسی نہ کسی وجہ سے منقطع ہو گئے، بعض سے دائمی جو آج تک قائم ہیں۔ غرض، شملے کا یہ تین سالہ قیام (۱۹۴۲-۱۹۴۵ء) میری ادبی زندگی کا نقطۂ آغاز ہی نہیں، اس کی تربیت کی بنیاد بھی ہے۔ میں نے شعر گوئی یہیں شروع کی اور میری نظمیں اور غزلیں بھی (جیسی کچھ بھی وہ تھیں) یہیں سے رسالوں میں چھپنے لگیں۔

میں ۱۹۴۵ء میں سرکاری دفتر کے ساتھ دلی آ گیا۔ بیشک، ادبی شوق کی آگ دل میں بھڑک اٹھی تھی۔ لیکن فن کے پہلو سے میں بہت ناقص تھا اور اسے سیکھنے کی

اشد ضرورت تھی۔ عروض کا ایک سوال بی اے فارسی کے پرچے میں شامل تھا۔ لیکن چونکہ کے۔ ایم۔ منزا کے اشارات (نوٹس) میں سب کچھ حل شدہ مل جاتا تھا، اس لیے مجھے فن کو بنیادی شکل میں پڑھنے اور جاننے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے بزمی انصاری کی کتاب زلیخائے سخن بھی خرید کر پڑھی، لیکن شعر اپنے وجدانی شعور ہی کے بل بوتے پر کہتا رہا۔
دلی کالج، جو ان دنوں اینگلو عربک کالج کے نام سے موسوم تھا، اس میں حلقۂ ارباب ذوق کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ اعجاز بٹالوی، محمد حسن عسکری، تابش صدیقی، تابش دہلوی، پریم ناتھ در، ریوتی سرن شرما، ڈاکٹر عبادت بریلوی، اور شاہد احمد دہلوی سے یہیں ملاقات ہوئی۔
ان سب شخصیتوں میں سے شاہد احمد دہلوی مرحوم نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ میں نے جب اپنی ایک نظم انھیں ساقی میں چھپنے کے لیے دی، تو انھوں نے مجھ سے پوچھا:
آپ نے یہ نظم کسی استاد کو دکھائی ہے؟ اور میرا جواب نفی میں سن کر فرمایا:
"بھیا حصولِ فن کے لیے از حد ضروری ہے کہ کسی ماہرِ فن سے مشورہ کیا جائے۔ میں اس کام کے نااہل ہوں کیونکہ خود شاعر نہیں، اور شاعری کے بارے میں کچھ زیادہ جانتا بھی نہیں۔"
انھیں کے مشورے سے میں نے جناب ضیا فتح آبادی کو خط لکھا اور ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ان دنوں میں کچنر روڈ (حال پٹیل مارگ) پر مجرّدوں کے ہوسٹل میں رہتا تھا۔ چند دن بعد ضیا صاحب کا جواب ملا کہ وہ صبح نو بجے سے پہلے اور شام چھ بجے کے بعد گھر پر مل سکتے ہیں۔ ان اوقات کے علاوہ اگر ان سے ملنا چاہوں، تو وہ ریزرو بنک آف انڈیا کی چاندنی چوک شاخ میں مل جائیں گے۔
میں ایک شام دفتر سے نکلا اور ریزرو بنک، چاندنی چوک پہنچ گیا۔ وہاں پوچھتا پاچھتا عمارت کی سب سے اوپر کی منزل پر پہنچا۔ تذکرۂ شعرائے پنجاب میں ضیا صاحب کی چھپی ہوئی تصویر میرے ذہن میں تھی۔ منزلِ مقصود پر پہنچ کر میں نے دیکھا

کہ ضیا صاحب بڑے انہماک سے کسی دوست کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں مصروف ہیں۔ میں چند منٹ، خاموشی سے کھڑا دیکھتا رہا۔ جب بازی ختم ہوئی، تو میں نے آداب عرض کہا اور اپنا تعارف کرایا۔ اس پر ضیا صاحب نے فوراً کھیل بند کر دیا، حال آں کہ شطرنج کے کھلاڑی کم ہی ایسا کرتے ہیں۔ ضیا صاحب کو شطرنج کا شوق ورثے میں ملا ہے، ان کے والد مرحوم منشی رام سوئی شطرنج کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔

اب ہم ان کے دفتر سے نکل کر جامع مسجد سے ہوتے ہوئے رگھبیر سنگھ جین بلڈنگ، دریا گنج پہنچے۔ ادبی گپ ہوتی رہی، ادبی دنیا کی باتیں، مولانا صلاح الدین احمد کی باتیں، میرا جی کی باتیں۔ ان کے اصرار پر میں نے انھیں اپنے کچھ شعر سنائے۔ پھر میں نے ان سے کلام سنانے کی فرمایش کی۔ انھوں نے اپنی دو تین تازہ غزلیں سنائیں۔ نیز اپنا مجموعۂ کلام، نورِ مشرق، بھی تحفۃً دیا۔ رات کا کھانا میں نے وہیں کھایا۔ بالکونی میں ان کی والدہ محترمہ بیٹھی تھیں اور ان کی گود میں ضیا صاحب کے فرزندِ رشید تھے، یہ ان دنوں کچھ بیمار تھے۔ شعر و شاعری کے علاوہ ضیا صاحب کو زائچے بنانے کا بھی بےحد شوق ہے۔ جوتش ودیا کے کئی ماہران کے گھر آتے اور یہ ان سے تبادلۂ خیالات کرتے رہتے۔ اس سلسلے میں ضیا صاحب نے مجھے بتایا:

> فراستُ الید (سامدرک) کا شوق مجھے کالج کے زمانے سے ہے۔ میری پیدائش پر میرا زائچہ جس پنڈت نے بنایا تھا، وہ انھیں کے پاس رہ گیا۔ جسے میں اب اپنا زائچہ کہتا ہوں، یہ میری والدہ کی یادداشت کی بنا پر ۱۹۲۵ء میں میرٹھ کے ایک پنڈت نے بنایا تھا۔ دہلی آنے کے بعد مجھے اپنے زائچے کی درستی کی فکر ہوئی۔ کئی جوتشیوں سے گفتگو ہوئی۔ رفتہ رفتہ خود جوتش ودیا سیکھنے کا شوق پیدا ہوا، جو مدراس پہنچ کر کافی ترقی کر گیا۔

ایک مرتبہ میرے دفتر میں ایک صاحب نے مجھے اپنا ہاتھ دکھا کر پوچھا کہ کیا وہ سمندر پار جائینگے۔ میں نے لکیروں کو غور سے دیکھا تو کوئی مددگار لکیر دکھائی نہ دی۔ چنانچہ میں نے ان کے سوال کا جواب نفی میں دے دیا۔ چند دن بعد انھوں نے بتایا کہ آپ کی پیشگوئی درست نکلی؛ میں مزید تعلیم کے لیے ولایت جانا چاہتا تھا اور اس کے لیے میں نے صدر دفتر سے اجازت کی درخواست کی تھی، مگر صدر دفتر نے انکار کر دیا ہے۔ اسی طرح دفتر کے ایک اور افسر نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا جلد ہی ان کا تبادلہ ہونے والا ہے۔ یہ ہفتہ کی بات ہے۔ میں نے سوال کا وقت نوٹ کر کے اتوار کو اس وقت کا زائچہ تیار کیا، جس سے مجھے لگا کہ وہ فوراً تبدیل ہو کر جانے والے ہیں، چنانچہ پیر کی صبح میں نے ان کے سوال کا جواب دے دیا۔ دوپہر کی ڈاک سے ان کے تبادلے کا حکم آ گیا۔ اب انھوں نے کہ کیا ان کا مدراس سے جانا ان کے لیے سود مند ہوگا۔ ان کا زائچہ تو موجود ہی تھا اس کی مدد سے میں نے کہا کہ ہاں، ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ترقی کی پوسٹ تو فوراً ہے نہیں۔ بہرحال وہ مدراس سے چلے گئے پھر میری ان سے ملاقات دہلی میں ہوئی، تو انھوں نے بتایا کہ ان کے لیے ایک خاص پوسٹ بنائی گئی ہے، اور ان کو ترقی مل گئی ہے۔ اسی طرح کے چند اور واقعات بھی ایسے ہیں جہاں میری پیشگوئی حیرتناک طور پر صحیح نکلی۔ میں اب تک خود نہیں سمجھ سکا کہ ایسا کیونکر ہوا۔

ہیں ہفتے میں دو بار ان کے وہاں جانا، اور اپنا تازہ کلام انھیں سناتا۔ وہ اسے بڑی توجہ سے سنتے اور مناسب تبدیلیوں کا مشورہ دیتے۔ بعض اوقات ماہنامہ شاعر کے لیے (جو ان دنوں آگرے سے نکلتا تھا) طرحی غزل کہنے کے لیے کہتے۔ میری

شاید دو غزلوں کا انتخاب انھیں دنوں شاعر میں چھپا بھی۔ ضیا صاحب مولانا سیاب اکبرآبادی مرحوم کے فارغ الاصلاح شاگردوں میں سے ہیں۔ انھیں اپنا کلام بغرضِ اصلاح دیکھتے رہنے کا بہت شوق ہے۔ وہ بار بار سوچتے اور اپنے کلام میں ردو بدل کرتے رہتے ہیں۔ ان کے چند شاگرد بھی ہیں۔ ان میں ایک نشانتی سروپ کیف تھے۔ وہ ان سے اپنے گیتوں پر اصلاح لیتے تھے۔ افسوس کہ وہ عین عالمِ شباب میں راہیِ ملکِ بقا ہوگئے۔ ان کے ایک اور شاگرد طالق ہمدانی تھے جو لدھیانہ کے رہنے والے تھے۔ تقسیمِ ملک کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سیماب مرحوم نے اپنے چند لائق فارغ الاصلاح شاگردوں میں مختلف علاقے تقسیم کر دیے تھے، اور اعلان کر دیا تھا کہ آیندہ ان کے مبتدی شاگرد اصلاحِ کلام کے لیے ان میں سے کسی کی طرف رجوع کریں۔ ضیا صاحب کا نام بھی اس فہرست میں تھا، اور پنجاب اور دلّی کا علاقہ انھیں تفویض ہوا تھا۔ چنانچہ طالق ہمدانی نے، جو سیماب کے شاگرد تھے، اپنا کلام اصلاح کی غرض سے ضیا صاحب کی خدمت میں بھیجنا شروع کیا۔ خلیق ایونوی بھی اسی زمانے سے اپنا کلام انھیں دکھاتے ہیں۔ ضیا صاحب کسی کو باقاعدہ شاگرد نہیں بناتے کیونکہ ان کے خیال میں استاد بننا کارِ محال ہے۔ تاہم ان سے مشورہ کرنے والوں کی کمی نہیں۔ نئے احباب میں رادھا کشن سہگل، جانباز پانی پتی، شاد اور شاہد ساگری وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ غرض میں بھی ان سے مشورہ کرنے لگا۔ جہاں اختلافِ رائے ہوتا، ان سے تفصیل سے بات کرتا، اپنا نکتۂ نظر پیش کرتا، ان کی بات سنتا۔ کیونکہ شعور ابھی پختہ نہیں ہوا تھا۔ مجھے ان کی اصلاح کا کچھ خاص فائدہ محسوس نہ ہوتا۔ رفتہ رفتہ سمجھ میں آنے لگا کہ اردو شاعری اتنی آسان نہیں جتنی میں سمجھے بیٹھا تھا۔

قدم قدم پر ٹھوکریں لگتیں۔ فنی غلطیوں کا شمار نہیں تھا۔ ان کی بتائی ہوئی غلطیوں پر بار بار غور کرتا۔ کئی بار محسوس ہوتا کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ شعروں کی تبدیل شدہ صورت سے ادا نہیں ہوا۔ ضیا صاحب کی طرف سے مجھے کھلی چھٹی تھی کہ ان کی

اصلاح قبول کروں یا نہ کروں ۔ ان دنوں کی بیشتر غزلیں میں نے پنڈت لبھورام جوش ملسیانی مرحوم کی زمینوں میں کہی تھیں۔

اب ضیا صاحب کے ہاں میرا آنا جانا مستقل تھا۔ ایک دو بار میں ان کے ساتھ سیتا رام بازار کی ایک دھرم شالہ کے مشاعرے میں بھی شامل ہوا۔ ضیا صاحب کی دلی کے شاعروں میں بڑی عزت تھی ۔ حکیم اعظم ایک اردو مجلّہ نکالتے تھے "دستگیر"۔ اس کا حصّہ نظم ضیا صاحب دیکھتے تھے۔ ان مشاعروں میں مونس لکھنوی مرحوم ، امن لکھنوی، مشیر جھنجھانوی، فیض جھنجھانوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، کالی چرن اثر اور بیسیوں دوسرے شعرائے کرام شامل ہوتے۔ استادوں کے پڑھنے کی باری کہیں آدھی رات کے بعد آتی تھی۔

لوگ بڑی تہذیب اور توجہ سے شعر سنتے، سلیقے سے داد دیتے۔ تحت اللفظ اور ترنم دونوں طرح شعر پڑھے جاتے تھے۔ ایک مشاعرے میں ضیا صاحب نے مندرجۂ ذیل غزل پڑھی اور ہر شعر پر خوب داد پائی:

غم بصورتِ فریبِ شادی ہے	فطرتِ غم ہی مسکرادی ہے
ہم نے چھیڑا ہے جب بھی سازِ جنوں	تیرگیٔ شب کی گنگنادی ہے
عالمِ وجد و بیخودی میں بھی تجھے	ہم نے آواز بارہا دی ہے
اے زمیں! ہم نے تیرے قدموں پر	آسماں کی جبیں جھکادی ہے
ہم نے طوفانِ شورشِ شیون سے	کشتیٔ صبر ڈگمگادی ہے
کوششِ امن تو بجا ہے، مگر	آدمی فطرتاً فسادی ہے
اے خدا! تو نے اپنے بندوں کو	زندگی کی کڑی سزا دی ہے

ان مشاعروں کے علاوہ وہ بوم برق کے جلسوں اور مشاعروں میں بھی شریک ہوتے ۔ ایک ایسے ہی جلسے اور مشاعرے کے بارے میں مولانا ابر گنوری مرحوم فرماتے ہیں:

اور اب آپ کے سامنے ملک کے نامور شاعر جناب ضیا فتح آبادی

تشریف لا رہے ہیں"۔ اور ایک حسنِ مردانہ کا مجسمہ، صبیح چہرہ، حسین
عینک لگائے، جھومتا جھامتا ڈائس پہ آ گیا اور نہایت خود اعتمادی
سے اپنی غزل سنائی۔ محفل کے جمود کو توڑ کر داد کا ہنگامہ بپا کر اکر
انتہائی بے نیازی سے اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

یہ واقعہ مشاعرۂ یومِ برق، دلّی کا ہے۔ یہی محفل تھی، جس میں ضیا صاحب اور ابر صاحب کی پہلی ملاقات ہوئی۔ ان کا ایک دوسرے سے غائبانہ تعارف تو ایک مدت سے تھا، لیکن آج تک کبھی ایک دوسرے سے ملے نہیں تھے۔

غرض اس کے بعد ضیا صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ مدتوں دلّی میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہر ملاقات پر میں یہ تاثر لے کر اٹھا کہ ضیا کتنے صاحبِ نظر ہیں۔ ان کا معیارِ سخن کتنا نکھرا ہوا اور ستھرا ہے۔ ان کی فنی معلومات کتنی وسیع ہیں۔ اور قدرت نے انھیں کتنا پرخلوص اور دردمند دل دیا ہے۔ وہ محبت کے آداب سے کتنے آشنا ہیں۔ وضع وفا سے کتنے مانوس ہیں۔ انسانیت کی ہمدردی کو کس درجہ عزیز رکھتے ہیں۔

پھر ضیا صاحب تبدیل ہو کر مدراس چلے گئے۔ وہاں کے مشاعروں میں کبھی ابر حسینیا کی ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ مدراس کے مشاعروں کی روح رواں بن گئے تھے۔ اہلِ مدراس نے ان کو وہی شاعرانہ مقام دیا جس کے وہ صحیح معنوں میں مستحق تھے۔ ضیا صاحب کے کلام کی مقبولیت اور ان کی ہر دلعزیزی کا راز اس بات میں پنہاں ہے کہ وہ وہبی شاعر ہیں۔ جو بات ان کے دل سے اٹھتی ہے، وہ قاری یا سامع کے دل پر اسی لیے اثر کرتی ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، دل سے کہتے ہیں، صرف زبان سے نہیں۔ اور حقیقت میں یہی کسی بلند پایہ شاعر کا امتیازی وصف ہونا چاہیے۔

ضیا ہر صنفِ سخن میں مہارت رکھتے ہیں۔ انھوں نے نہایت کامیاب نظمیں، غزلیں، گیت، قطعے، اور رباعیاں کہی ہیں۔ آپ ان کا جس صنف کا کلام مطالعہ کریں،

یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہی ان کا خاص رنگ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ہر صنفِ سخن کے مزاج شناس ہیں اور اس میں وہی اسلوب اختیار کرتے ہیں جو اس کے لیے موزوں ہے اور وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں، جو اسے درکار ہیں۔

اپنا موجودہ مقام حاصل کرنے کے لیے انھیں کتنی ریاضت کرنا پڑی ہوگی، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ضیا کو شاعری کا مذاق تو وراثتاً نہیں ملا، لیکن ذوقِ سلیم یقیناً وراثتاً ملا ہے۔ ان کے والد لالہ منشی رام سونی کو موسیقی سے فطری لگاؤ تھا، حالانکہ پیشہ کے لحاظ سے وہ سول انجینیر تھے۔ ان کے گھر میں خاص طور سے دورانِ قیام جے پور دن رات بزمِ موسیقی گرم رہتی تھی۔ یہاں ضیا صاحب نے بھی ہارمونیم پر طبلہ کی سنگت میں گائن ودیا سیکھی۔ لیکن وہ زیادہ دن اس راہ پر نہیں چل سکے۔ ضیا کی والدہ مرحومہ شریمتی شنکر دیوی حد درجہ شفیق اور نرم دل واقع ہوئی تھیں۔ ضیا صاحب کے بقول ان کی تخیل اور حسّاس دل کی تخلیق کی ذمہ دار ان کی والدہ ہی تھیں۔

ضیا صاحب آج سے ۶۴ برس قبل ۹ فروری ۱۹۱۳ء کو پنجاب کے مشہور شہر کپورتھلہ میں اپنے ماموں لالہ شنکر داس پوری کے جدی مکان میں پیدا ہوئے۔ پوری صاحب اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مستقل طور پر کپورتھلہ میں مقیم تھے۔ ان کے ماموں انگلینڈ سے فوٹوگرافی کا فن سیکھ کر آئے تھے مگر انھوں نے تمام عمر کوئی کام نہیں کیا۔ صرف آبا و اجداد کی چھوڑی ہوئی زمینوں کی آمدنی پر بسر کرتے رہے۔ البتہ ان کے دوسرے بھائی ریاست کپورتھلہ میں اچھے عہدوں پر فائز رہے۔ ضیا صاحب کے بڑے ماموں لالہ درگا داس نے سرکارِ برطانیہ سے رائے بہادر کا خطاب بھی پایا تھا۔ ضیا صاحب کی پرورش ان کے آبائی گاؤں فتح آباد میں ہوئی۔ فتح آباد جو ترن تارن (امرتسر) سے گوندوال کے رستے میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس گاؤں کی مٹی سے ضیا صاحب کو صرف ایک طرح کی روحانی نسبت رہی ہے۔ کیونکہ یہاں ان کے بچپن کا کچھ زمانہ گزرا تھا، جو

انھیں اچھی طرح یاد بھی نہیں - ہوش سنبھالنے کے بعد وہ وہاں تین چار مہینوں سے زیادہ نہیں رہے - فطرتاً کم آمیز ہونے کی وجہ سے بیشک انہیں بہت نقصان پہنچا لیکن اسی کی بدولت ان میں دروں بینی کی عادت بھی پیدا ہوگئی، جس سے ان کی شاعری کو چار چاند لگ گئے۔ وہ بھیڑ اور مجمع سے گھبراتے تھے۔ خلوت اور تنہائی میں، انھیں فکرِ سخن کا کافی موقعہ ملا۔

ان کا ذوقِ شعری خداداد ہے۔ ان کے خاندان میں کوئی ادیب اور شاعر نہیں ہوا۔ دس برس کی عمر ہوگی، جب انھوں نے اردو شعر سنے، تو وہ ان سے بہت متاثر ہوئے - وہ اکثر سوچتے رہتے کہ شعر کیسے کہا جاتا ہے! شعر کہنے کا ڈھنگ کچھ عرصہ بعد انھوں نے جناب اصغر علی حیا سے سیکھا جو جے پور میں انھیں گھر پر اردو پڑھاتے تھے - یہ اس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے اور ان کی عمر چودہ پندرہ برس کی تھی - جے پور میں انھوں نے ایک شمعی مشاعرہ بھی پڑھا، لیکن یہ ان کی شاعری کے بالکل ابتدائی دور کی بات ہے - ان کے شوقِ شعر گوئی کو گوارا فضا اس وقت ملی، جب ۱۹۲۹ء میں دسویں کا امتحان پاس کر کے انھوں نے امرتسر کے ہندو سبھا کالج میں داخلہ لیا - امرتسر میں ان کے فیملی ڈاکٹر شفاعت احمد (ہومیو) پریکٹس کرتے تھے۔ وہ شعر بھی کہتے اور تسنیم تخلص کرتے تھے - ان کے ذریعے سے ضیا صاحب کی فرخ امرتسری تک رسائی ہوئی اور یہ ان کے شاگرد بن گئے - ان دنوں وہاں ایک ہفتہ واری مشاعرہ ہوتا تھا - یہ اس میں طرحی غزلیں پڑھنے لگے - امرتسر ہی کے دو پرچوں چمن اور چمنستان (ماہانہ) میں ان کا اس دور کا کلام چھپا - انھوں نے ملاپ اور پرتاب، لاہور کے طرحی مشاعروں میں بھی حصہ لیا - یہ شعر اس زمانے کی یادگار ہے:

کیا ٹھہر سکتا فروغِ زردے جاناں دیکھ کر ہوگیا مدہوش اخترِ مہرِ تاباں دیکھ کر

سب سے پہلے انھیں ڈاکٹر اقبال کی اس غزل نے متاثر کیا تھا:

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

یہ ان کے جے پور کے دورانِ قیام کا ذکر ہے۔ امرتسر ہی میں انھوں نے پہلی مرتبہ احسان دانش کو سُنا۔ احسان ان دنوں اپنا نام احسان بن دانش لکھتے تھے۔ وہ بیحد دلکش انداز سے پڑھتے تھے۔ مشاعرے میں وہ حاوی اور کامیاب رہتے۔

کالج میں ضیا صاحب کے چند ہم جماعت بخاری، تپش وغیرہ بھی شاعر تھے۔ ان دنوں ان کی دو ایک غزلیں کالج میگزین میں بھی چھپیں۔ مشاعروں میں شریک ہونے اور رسائل اور اخبارات میں چھپنے اور شعرا کے ہجوم میں گھرے رہنے کے باوجود ان کی کم آمیزی کی عادت نہ گئی۔ وہ سب سے الگ تھلگ رہتے۔ اسی لیے کسی شخص نے ان کے ذوق شعر گوئی کو ابھارنے اور بڑھانے میں مدد نہیں کی۔ بعد میں جب وہ فارمین کرسچین کالج، لاہور میں داخل ہوئے، تو کالج میگزین کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔

ان کی فطری کمزوری یعنی خلوت پسندی لاہور کے چار سالہ قیام میں بھی ان کے ساتھ رہی وہ براہِ راست کسی شاعر کے زیر اثر نہیں آئے، حالانکہ اس وقت اقبال لاہور میں موجود تھے۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری، ساغر، احسان دانش، تاثیر، ہری چند اختر اپنا مقام بنا چکے تھے۔ تاجور کے گروہ میں میلارام وفا، وقار انبالوی تھے۔ بیرونیوں میں مرزا فہیم بیگ چغتائی مستقل طور پر لاہور میں مقیم تھے۔ ان کے کالج کے ساتھیوں میں بھی شاعروں کی کمی نہیں تھی۔ عطا اللہ کلیم تھے، سراج الدین ظفر تھے، اور کتنے لوگ تھے۔ لیکن ان سب سے بھی رابطہ محض مشاعروں تک محدود رہا۔ منصور احمد (ادبی دنیا) سے ان کی ملاقات عطا اللہ کلیم نے کرائی اور ضیا کی اولین تصنیف 'طلوع' پر منصور احمد نے محض چند سطری ریویو کی جگہ ایک مختصر مضمون لکھ کر انھیں دنیائے ادب سے روشناس کرا دیا۔ یہ مضمون ادبی دنیا کے مارچ ۱۹۳۴ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

ضیا صاحب فرخ امرتسری کے باقاعدہ شاگرد تھے۔ لیکن انھوں نے چند غزلیں حق المحنت ادا کر کے جناب فیروز طغرائی کو بھی دکھائیں۔ تھوڑی ہی مدت بعد وہ سیماب اکبرآبادی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے، اور پھر مدۃ العمر

انھیں کے شاگرد رہے۔ یہ ان کی عادت میں نہیں کہ ہر کسی سے اصلاح لیں یا مشورہ کریں۔ یہاں تک کہ انھوں نے دوستوں میں سے بھی کسی سے مشورۂ سخن نہیں کیا۔
سیماب مرحوم کی شاگردی کا بھی ایک عجیب قصہ ہے۔ وہ اپنی والدہ کے لیے انگریزی دواؤں کی دکان بلوم اینڈ کمپنی سے مارفیا لینے امرتسر سے لاہور اکثر جایا کرتے تھے۔ لاہور ریلوے اسٹیشن سے باہر پٹری پر ایک صاحب رسائل اور اخبارات پھیلا کر بیچا کرتے تھے۔ جب ضیا صاحب لاہور جاتے، ان رسائل و اخبارات کو ایک اچٹتی نظر ضرور دیکھتے۔ ایک مرتبہ ان کی نظر ایک نئے رسالہ 'شاعر' پر پڑی۔ انھوں نے اٹھالیا۔ ورق گردانی جو کی، تو طرح کے مشاعرے کے ذیل میں اپنے ہم جماعت تپش کی غزل دیکھی۔ تپش کے نام کے ساتھ لکھا تھا سیمابی۔ 'شاعر' پہ مدیر کا نام سیماب اکبر آبادی درج تھا۔ ان دنوں ضیا صاحب، فرخ امرتسری سے اصلاح لیتے تھے لیکن اس سے کچھ غیر مطمئن سے تھے۔ "شاعر" کا یہ پرچہ دیکھنے کے بعد انھوں نے سیماب صاحب کو ایک خط لکھا کہ اگرچہ میں اپنا کلام فرخ صاحب کو دکھاتا رہا ہوں، لیکن میں آپ کا شاگرد بننا چاہتا ہوں۔ سیماب صاحب کا جواب آیا کہ اگر آپ کے تعلقات فرخ صاحب سے استوار نہ ہو سکیں تو کلام بھیج دیا کریں۔ اس پر ضیا صاحب نے اپنا کلام سیماب صاحب کو بھیجنا شروع کر دیا اور وہ باقاعدہ سیماب کے شاگرد بن گئے۔ یہ ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔ کثیر المشاغل ہونے کے سبب سیماب صاحب شاگردوں کی اصلاح پر پوری توجہ نہیں کر سکتے تھے نہ اصلاح کی توجیہہ بیان کرتے۔ شروع شروع میں ضیا صاحب نے ان سے توجیہہ کی درخواست کی، تو سیماب صاحب نے ساغر نظامی صاحب کو لکھا کہ اب ضیا امرتسری بھی اصلاح کی توجیہہ چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ضیا صاحب نے خود ہی وجہ اصلاح سمجھنے کی کوشش کی اور استاد سے استفسار سے گریز کیا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ضیا صاحب اصلاح سے مطمئن نہیں تھے۔ اس صورت میں انھوں نے یا تو شعر بدل دیا یا اسے حذف ہی کر دیا، استاد سے مزید استفسار کی ضرورت نہیں سمجھی۔ آج کل

بھی جو چند اصحاب ان سے مشورہ کرتے ہیں، وہ ان سے یہی کہتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ وہ ان کی اصلاح ضرور ہی قبول کریں البتہ اتنا ضرور چاہتے ہیں کہ ان سے مشورہ کرنے: اے دوست وزن اور زبان و بیان کے دوسرے اصولوں کا لحاظ ضرور رکھیں شعر کمزور ہو تو ہو لیکن اسے با وزن لازماً ہونا چاہیے۔

جوش ملیح آبادی نے ان کے دوسرے مجموعۂ کلام "نور مشرق" کے دیباچے میں لکھا:

> ضیا صاحب نے، اس میں کوئی شک نہیں، ایک صحیح راستہ اختیار کیا ہے، لیکن میں انھیں مطلع کر دینا چاہتا ہوں کہ ان کی راہ میں ایک پتھر بھی موجود ہے، اور وہ ہے، نوجوانی کے باوصف ان کی سادگی و سلامت روی، جس پر نگاہ کرکے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے شباب اور اپنے موسم کے ساتھ خلوص نہیں رکھتے ہیں۔ ہر چند یہ خوشی کی بات ہے کہ اب تک ایسی کوئی شہادت فراہم نہیں ہوئی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا کہ **اپنی جوانی اور موسم کے بعض دیگر صالح نوجوانوں کی طرح** بائی بھی ہیں، پھر بھی اپنی فصل بہار سے خلوص نہ رکھنا ایک ایسی چیز ہے، جو شاعر کے ادبی مستقبل کو بے سواد بنا دینے کی دھمکی دیتی رہتی ہے۔

اس کے بارے میں ایک مرتبہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے ضیا صاحب نے فرمایا تھا: "جوش صاحب فن اور عمر میں مجھ سے بڑے ہیں اور میں انھیں ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھتا رہا ہوں، دوست نہیں۔ میں ۱۹۳۶ء میں مستقلاً دہلی آگیا اس زمانے میں جوش صاحب دریا گنج میں رہتے تھے اور وہیں سے "کلیم" نکالتے تھے۔ جناب آزاد انصاری بھی ان کے ساتھ مقیم تھے۔ میں ہفتے میں کم از کم ایک بار ضرور ان کے یہاں جاتا تھا، اور یہ اکثر دفتر کے بعد شام کا وقت ہوتا۔ یہی وقت جوش صاحب اور آزاد صاحب کی مینوشی کا بھی ہوتا تھا۔ جوش صاحب ہمیشہ مجھے مجبور کرتے تھے کہ میں بھی ان کا ہم مشرب ہو جاؤں۔ لیکن میری فطری احتیاط اور جھجک مانع رہی اور

ہیں کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر پہلو بچا جاتا۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جوش صاحب نے یہ سب کچھ لکھ دیا۔ میرے نزدیک محبّت کا جذبہ تقدس کا حامل ہے۔ میں جنس اور محبت کو الگ الگ خانوں میں رکھتا ہوں۔ اگر میں کہوں کہ میں نے جنسی میلان یا کشش کبھی محسوس ہی نہیں کی، تو یہ خود فریبی ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری جنسی کشش کبھی محبت نہ بن سکی اور میں نے جنسی تسکین کو انسانیت کے ارتقا کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔ جہاں میں محبّت کو انسانی جذبات کا فطری اقتضا خیال کرتا ہوں، وہیں جنس کی تسکین اور اس کے اعلان کو بھی معیوب خیال کرتا ہوں۔ کاش جوش صاحب کی نظر "نورِ مشرق" ہی میں موجود نظموں "حسنِ گمراہ"، "اپنی میرا ہے" اور "دیوی" پر پڑتی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس معاملے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں محبّت سے جتنا قریب ہوں، اتنا ہی ہوسناکی سے دور۔ عقل و دل کا توازن بگڑ جاتا ہے تو انسان کو تخریب کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے، جوش صاحب اور ان کے ہمنیواں شعرا کی اردو میں کوئی کمی نہیں۔ شاید وہ مجھ سے متفق نہ ہوں اور محبت تک پہنچنے کے لیے ہوسناکی کو ضروری جانتے ہوں اور اس کی اشتہار بازی کو شاعری کا کمال۔"

ضیا صاحب کی سادگی ضرب المثل ہے۔ وہ محبّت اور مروّت کا مجسمہ ہیں۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع ہے۔ ادبی دنیا میں بھی ان کے دوستوں اور مدّاحوں کی تعداد کچھ کم نہیں۔ یہ درست ہے کہ بقول ضیا صاحب، ان کے زائچے میں دشمنوں کی نشاندہی زیادہ ہے، حال آں کہ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان سے نقصان بہت کم پہنچے گا۔ خود ان کا بھی یہ تجربہ ہے کہ وہ جن سے دوستی کا حق نباہتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی ناگوار باتوں تک کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں، وہی ان کی کسی معمولی سی بات سے خفا ہو کر ان کے دشمن بن جاتے ہیں، یا دوست نہیں رہتے۔ ضیا صاحب میں کمی یہ ہے کہ وہ دوست بنانے اور دوستی قائم رکھنے کا آرٹ نہیں جانتے۔ وجہ یہ ہے کہ ان میں کسی قسم کی کوئی علّت نہیں اور بقول ان کے دوستی قائم

رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی علّت ضروری ہے، جو فریقین میں برابر موجود رہے۔ اس کے باوجود ضیا صاحب کو اپنے کثیر الاحباب ہونے کا دعویٰ ہے۔ بیشک ان کے دوستوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ لیکن انھوں نے بارہا یہ بھی کہا ہے کہ میں دوست بنانے میں ماہر نہیں باستثنائے ان چند حضرات کے جن سے ان کے تعلقات زیادہ تر ادبی نوعیت کے رہے ہیں، کم آمیزی کے باعث وہ لاہور، دلّی، مدراس، بمبئی، کے نیم ادبی حلقوں میں رہ کر بھی وہ کسی کو اپنا صحیح دوست نہ بنا سکے۔ دفتر میں یا ملازمت کے سلسلے میں جن لوگوں سے وہ ملے، یا جو ان کے دوست بنے ان میں تارا چند پیجی اور کیلاش چندر ناز کے سوائے کسی کو ادب اور خاص کر اردو ادب سے کوئی زیادہ شغف نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حلقۂ احباب میں کوئی ایسا نام نہیں ملے گا، جو حکومتی حلقوں میں موثر ہو۔

بار بار لوگ انھیں فریب دیجاتے ہیں۔ ان سے کام نکال لیتے ہیں لیکن اگر ضرورت پڑے، تو خود ان کا کوئی کام نہیں کرتے۔ اکثر دوستوں کی انھوں نے اپنی ملازمت کے زمانے میں بہت مدد کی۔ ایک دوست کی بیوی کے انھوں نے سو سو روپے کے نوٹ بدلوا کر دیئے حالانکہ ان کے میاں صاحب ان کے دوست ہوتے ہوئے کئی ایک گستاخیاں کر چکے تھے۔ دلّی کے ایک ادبی مجلّہ کے مالک ان سے اکثر بنک کے معاملوں میں مدد لیتے رہے ہیں۔ منور لکھنوی مرحوم نے صحیح فرمایا تھا کہ

جب کبھی میں پھنس گیا ہوں اس کے مایا جال میں
کی ہیں میری مشکلیں آسان بیت المال میں

انھوں نے سب کی غلطیوں کو معاف کر کے سب سے محبت کا سلوک روا رکھا ہے۔ بنک میں لوگوں کی خاطر تواضع کی ہے اور ان کے بگڑے کام سنوارے ہیں۔ چھوٹوں کا وہ اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ ان سے بے اختیار محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ضیا صاحب کی گھریلو زندگی بے حد خوشگوار اور ہموار رہی ہے۔ بقول ان کے

اس خوشگواری اور ہمواری کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۷۱ء
۳۵ برس تک ایک ہی کھونٹے سے بندھے رہے یعنی ایک جگہ ملازم رہے ہیں۔
البتہ ملازمت سے باہر انھوں نے اپنے گھر میں کافی اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔
چنانچہ وہ بھی اپنے دل میں اس ابدی شکایت کی کسک محسوس کرتے ہیں ؎

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ان کا ایمان ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو شاید کب کے ترکِ سخن گوئی کر چکے ہوتے۔ انھوں نے گھر کے کسی کام کاج میں آج تک دخل نہیں دیا۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ گھر سے باہر کا کام یعنی روزی کمانے کا فرض مرد کے ذمے ہے اور گھر کے اندر کا کام، جس میں بازار سے سودا سلف لانا، خریدنا بھی شامل ہے، بیوی کے ذمے۔ خوش قسمتی سے انھیں بیوی بھی ایسی ملی ہے، جس نے ضیا صاحب کی ناز برداری میں اپنی صحت تک خراب کر لی ہے۔ ویسے ہر انسان میں کچھ کمزوریاں ضرور ہوتی ہیں، اور ان کے کہنے کے مطابق ان کی بیوی میں بھی ہونگی لیکن ان کی بیوی کی اچھائیاں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی کمزوریوں کی طرف کبھی دھیان جا ہی نہیں سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی آپس میں چھیڑ خانی بھی چلتی رہتی ہے، اور کبھی کبھی میاں بیوی ایک دوسرے سے کشیدہ بھی ہو جاتے ہیں لیکن یہ خفگی ہمیشہ عارضی ہوتی ہے غرض بقول داغ

بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

ضیا صاحب کی پہلی شادی دسمبر ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی۔ ان بیگم کا ۱۹۴۰ء میں زچگی میں انتقال ہو گیا۔ دو برس بعد ان کی موجودہ بیوی آئیں۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۶ء کے درمیان خداوند کریم نے انھیں سات بیٹے بخشے۔ بدقسمتی سے پہلا بچہ ایک ماہ کے اندر اندر چل بسا۔ بفضلہ تعالیٰ باقی سب بچے زندہ سلامت اس بڑھاپے میں ماں باپ کی آنکھ کا تارا اور زندگی کا سہارا بنے ہوئے ہیں۔ خدائے کریم انھیں لمبی اور تندرست اور مفید زندگی عطا فرمائے۔ تین بچے ہیں دلّی کے مختلف بنکوں

ملازم ہیں۔ ایک بچہ لندن میں مقیم ہے اور وہیں ملازمت کر رہا ہے۔ ایک لڑکا خود کو سنوارنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہے۔ سب سے چھوٹا لڑکا ابھی کالج میں پڑھ رہا ہے۔ شاعر اپنے کلام کی اور والدین اپنے بچے کی ہمیشہ تعریف کرتے ہیں۔ پھر بھی ضیا صاحب نے وثوق سے کہا ہے کہ ان کے بچے ہزارہا دوسرے بچوں کے مقابلے میں کئی اعتبار سے اچھے ہیں۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر ضیا صاحب نے اپنا ذاتی مکان راجوری گارڈن (نئی دہلی) میں بنا لیا ہے اور وہیں اب ان کا مستقل قیام ہے۔

(۲)

ضیا صاحب نے کبھی اپنی خودداری کو نہیں چھوڑا۔ نہ وہ اوچھے ذرائع سے مقبولیت حاصل کرنے کے قائل ہیں۔ انھوں نے اپنے تمام مجموعے اپنے خرچ سے چھاپے ہیں۔ ان کی کتابوں کی تفصیل یہ ہے:

(۱) "طلوع" ۱۹۳۴ میں چھپا۔ اس زمانے میں ساغر نظامی نے میرٹھ میں اپنا ہینڈ پریس قائم کیا تھا۔ یہ مجموعہ وہیں چھپا۔ سائز چھوٹا حجم ۴۶ صفحات تعارف از ساغر نظامی (صفحات ۱ تا ۸) کل ۵۶ قطعات ہر صفحہ پر ایک قطعہ قیمت درج نہیں۔

(۲) "نور مشرق" کی طباعت دسمبر ۱۹۳۷ء میں گپتا پرنٹنگ ورکس، دلّی میں ہوئی۔ بانگِ درا سائز۔ حجم ۱۵۲ صفحات۔ تعارف (۱) از جوش ملیح آبادی تعارف (۲) از حکیم آزاد انصاری، تعارف (۳) از منظر صدیقی اکبر آبادی۔ ۴۷ نظمیں ۱۰۲ صفحے تک، ۷ گیت ۱۱۶ صفحے تک، آخر میں ۹ سانیٹ۔ بقول ضیا صاحب غالباً یہ پہلا شعری مجموعہ تھا جس میں نظموں کے ساتھ گیت بھی شامل کیے گئے۔ مگر تعجب ہے کہ کسی محقق نے ابھی تک اس بات کی تائید یا تردید میں کچھ نہیں کہا۔

(۳) "ضیا کے سو شعر" کی کتابت اور طباعت نور مشرق ہی کی طرح ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ سائز ۲۰×۳۰/۳۲ حجم ۳۲ صفحات تقریب از مصنّف ایک صفحہ۔ ہر صفحے پر تین یا چار اشعار

(۴) "نئی صبح" کی اشاعت کی ایک کہانی ہے۔ علامہ سیماب مرحوم کی وفات کے بعد ضیا صاحب نے ایک ماہنامہ "سیماب" دلّی سے جاری کیا تھا جو ۱۹۵۱-۱۹۵۲ء سال بھر نکلتا رہا۔ "نئی صبح" کی نظمیں، غزلیں وغیرہ پہلے جستہ جستہ "سیماب" ہی میں چھپی تھیں۔ بعد میں انھیں فرموں میں ایک اور فرمے کا اضافہ کرکے اسے کتابی صورت دے دی گئی۔ یہ مجموعہ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ حجم ۰۰ صفحے۔ قیمت عہ۔ شروع میں منور لکھنوی کی نظم بعنوان "ضیا فتح آبادی" ہے اس کے بعد پروفیسر بشّر علی صدیقی کا مضمون "ضیا فتح آبادی کی شاعری" ۲۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ پھر کرنیں کے عنوان سے ۴۸ رباعیاں اور قطعے ہیں: ہر صفحے پر چار رباعیاں یا قطعے ہیں۔ سوزِ دوام کے عنوان سے ۲۶ غزلیں ہیں۔ نئی صبح کے عنوان سے ۲۶ پابند نظمیں، ۳ آزاد یا معرّا نظمیں اور ۳ گیت ہیں۔

(۵) "گردِ راہ" ۱۹۶۳ء میں دلی پرنٹنگ ورکس میں چھپی۔ سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ حجم ۱۸۴ صفحات۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔ ابراحسنی گنوری کا مضمون "ضیا اور ان کی شاعری" صفحات ۴ تا ۱۳ اور تعارف از خوشتر گرامی صفحات ۱۴ تا ۱۶ پہلا باب نور در رنگ جس میں ۴۴ رباعیات ہیں۔ دوسرا باب خشت و سنگ جس میں ۷۴ پابند نظمیں۔ ۶ گیت اور ۸ آزاد نظمیں ہیں۔ آخر میں باب نغمہ و آہنگ میں ۳۷ غزلیں ہیں۔

(۶) "حسن غزل"۔ یہ مختصر سا مجموعہ ۱۹۶۶ء میں انبالہ سے شائع ہوا۔ سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ صفحات ۱۶۔ اس میں ضیا صاحب کی ۲۸ غزلیں شامل ہیں۔

(۷) "شعر اور شاعر"۔ ۱۹۷۴ء میں جمال پرنٹنگ پریس، دہلی میں چھپا۔ سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$۔ حجم ۱۶۰ صفحات۔ اس مجموعے میں ضیا صاحب نے بیس شعرا کے خود نوشت سوانح حیات مع نمونۂ کلام جمع کرکے بزمِ سیماب، دہلی کی طرف سے شائع کئے ہیں۔ شعرا کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ قیمت ۱۵ روپے۔

ضیا صاحب کی شاعری کا سب سے بڑا مقصد تسکینِ ذات ہے۔ جب جذبات

میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور دماغی کناروں سے ٹکراتی ہے تو دماغ کا تخلیقی عمل اسے تخریبی کارروائی سے باز رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو، تو دماغی توازن بگڑ جائے۔ یہ تخلیقی عمل ہر انسان کی زندگی میں پایا جاتا ہے اور مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے، مگر شاعر اس ہیجانی کیفیت کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ مقصدی یا افادی شاعری دراصل کوئی چیز نہیں۔ شاعر اپنے ماحول کی پیداوار ہے۔ وہ جس ماحول میں پلتا ہے، اس کی عکاسی کرتا ہے۔ ادب اور شعر جو بقول ضیا صاحب ترقی پسندی اور جدیدیت کے طفیل چھپایاں کرتا ہے غیر یقینی ہے۔ دنیا میں کوئی ادب ایسا نہیں، جس نے زندگی کے کسی نہ کسی گوشے کی نقاب کشائی نہیں کی۔ ضیا صاحب کے نزدیک افادی ادب وہ ہے جس سے فنکار متضاد حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ دراصل ادب کو خانوں میں تقسیم کرنا ہی قباحت ہے۔ "وہ شاعری جز و یست از پیغمبری" کہہ کر ڈاکٹر اقبال نے گویا حکم لگا دیا کہ شاعری میں پیغام ہونا چاہیے۔ اب ہر شاعر اپنے یہاں اور ہر ناقد، شاعر کے یہاں پیغام کی تلاش میں لگا ہے۔ اگر ضیا کا نظریۂ شاعری "تسکین ذات" صحیح ہے، تو شاعر کا ہر شعر کسی نہ کسی پیغام کا حامل ہوتا ہی ہے۔ کبھی غم کا، کبھی خوشی کا، کبھی محبت کا، کبھی نفرت کا، کبھی غلامی کا، کبھی آزادی کا، کبھی انسانیت کا۔ ضیا صاحب شاعری کو کسی واحد پیغام تک محدود کر دینے کے حق میں نہیں۔ شاعر روزمرہ کی زندگی میں جن گوناگوں کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ اس کی شاعری میں بھی ان کیفیتوں کی پرچھائیاں نظر نہ آئیں۔ خواہ تکرار اور تضاد ہی کیوں نہ چل نکلے۔ ضیا صاحب کی شاعری چونکہ زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں اور حالات کے پیدا کردہ تاثرات کی عکاسی کرتی ہے، اس لیے ان کے یہاں بعض جگہ تضاد کا گمان ہوتا ہے حال آں کہ اس سے دراصل ان کے سفر کی مختلف منزلوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ امن لکھنوی نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اسی تضاد کی کیفیت کی طرفداری کی ہے اور غور سے دیکھا جائے تو تضاد

کس کے ہاں نہیں! یہ کیفیت ناگزیر ہے۔

ضیا صاحب کا فکرِ سخن کا طریقہ بھی بہت، دلچسپ ہے۔ وہ بستر پر لیٹ جاتے ہیں، کاغذ پنسل ہاتھ میں لیے ذہن کو یکسو کرنے کے لیے ذرا سہارا لیتے ہیں، پنسل کو انگلیوں پر متواتر اچھالتے رہتے ہیں۔ تا آں کہ ان کے دماغ میں مصرعے موزوں ہونے لگتے ہیں، اور وہ انھیں کاغذ پر منتقل کرتے جاتے ہیں۔ اس عملِ تخلیق کے لیے صبح شام، دن رات، وقت کی کوئی قید نہیں۔ ہاں، کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا، کہ غزلوں کے اشعار غیر معمولی ماحول میں ہو گئے مثلاً بس کے انتظار میں کھڑے ہیں، یا بس میں سفر کر رہے ہیں، اور شعر ہو گیا ہے! اب غزل پھر کسی وقت مکمل ہو جائیگی۔ شعر میں الہام کے قائل تو نہیں، مگر یہ بھی صحیح ہے کہ کبھی کبھار ایک مصرع یا پورا شعر غیر شعوری طور پر موزوں ہو گیا۔ اگرچہ یوں تو غیر شعوری کیفیت کا سراغ بھی کہیں نہ کہیں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

ضیا صاحب نے نظمیں بھی لکھی ہیں، پابند بھی اور آزاد بھی۔ غزلیں بھی کہی ہیں۔ اور گیت، نعت، قطعات اور رباعیات میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ میراجی کو ان کی آزاد نظمیں اور غزلیں پسند تھیں۔ ان کی پابند نظمیں پڑھ کر ماہر القادری کے ذہن میں چکبست کی یاد تازہ ہو گئی۔

یوں تو قنوطیت نہ کلامِ ضیا کی خصوصیت ہے، نہ ان کے مزاج کی۔ لیکن نہ جانے، حضرت فانی کی پرچھائیں کیسے ان کے کلام میں کہیں کہیں آ گئی ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے لکھا تھا کہ ضیا کا کلام پڑھکر رونے یا سونے کو جی نہیں چاہتا۔ خدا معلوم وہ کیا حالات ہونگے، جن میں انھوں نے ایسے شعر کہے:

زندگی ہے بذاتِ خود اک موت   موت کا انتظار کون کرے!
کون پامالِ روزگار نہیں   شکوۂ روزگار کون کرے

میں نے جب ضیا صاحب کی توجہ ان اشعار کے قنوطی لہجے کی طرف مبذول کرائی، تو انھوں نے جواب میں وضاحت سے فرمایا تھا کہ مجھے اتفاق ہے کہ ان اشعار

میں قنوطیت جھلکتی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کو میرے یہاں اس قسم کے ادبی کئی اشعار مل جائیں، مگر میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ زندگی کے زخموں کو دکھاؤں، اور پھر ان کا کوئی علاج بھی تجویز کروں، تاکہ زندہ رہنے کی ہمت بندھی رہے۔ ان اشعار میں بھی یہی دونوں عمل کارفرما ہے۔ پہلا عمل واقعی قنوطی ہے، مگر دوسرا پُرامید ہے۔ اب پہلے ہی شعر کو لیجیے۔ غموں اور مصائب سے ترتیب پائی ہوئی زندگی خود ایک مسلسل موت ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر انسان بےحس و حرکت موت کے انتظار میں کیوں بیٹھا ہے، جو بہر حال اپنے طے شدہ وقت پر آنے والی ہے۔ یعنی آدمی کو زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دل سے موت کا خوف نکال دے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں ان لوگوں کے لیے صبح کی ایک کرن پیش کی گئی ہے، جو رات کے ہولناک اندھیروں سے گھبرا کر شور و شغب کو اپنا وطیرہ بنا لیتے ہیں۔ جب ہر شخص پامالِ روزگار ہے، تو شکوۂ روزگار بےسود ہے۔ چاہیے کہ اپنا قیمتی وقت شکوہ و شکایت میں نہ ضائع کیا جائے۔ ایک مرتبہ میں نے ضیا صاحب سے پوچھا تھا کہ ان کی زندگی سُکھ چین کی زندگی رہی ہے، یہ شعر انھوں نے کن حالات میں تخلیق فرمایا:

ازل میں جب ہوئی تقسیمِ عالمِ فانی بطورِ خاص ملا سوزِ جاوداں مجھ کو

ضیا صاحب نے جواباً فرمایا:

> یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میری زندگی ہمیشہ سُکھ چین سے عبارت رہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض دیگر فنکاروں کی طرح میں نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو مشتہر و بےنقاب نہیں کیا۔ دراصل زندگی سے مجھے محبّت ہے، اور میں کسی ایسی حرکت کو محبّت کی توہین سمجھتا ہوں۔ میرے والد مرحوم کی ملازمت مستقل نہیں تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ انھیں ایک ملازمت کے بعد دوسری ملازمت فوراً بغیر وقفے کے ملتی رہی۔ میں نے زمانۂ تعلیم

ہی میں ایک وقت ان کی جیب میں ایک لاکھ روپیہ بھی دیکھا، اور پھر ان کی جیب کو خالی بھی پایا۔ اپنی نجی زندگی کا مقابلہ میں نے جب انسان کی عام زندگی سے کیا، تو مجھے کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ دل کی تڑپ ہی انسان کو انسان بناتی ہے۔ یہ تڑپ، یہ سوز آپ اس کے دل سے علیحدہ کر دیجیے، تو یقین ہے کہ دل کی دھڑکن بند ہوجائے اور انسان اور حیوان میں کوئی تمیز ممکن نہ رہے۔ اسی تڑپ اور سوز کو دوسرے لفظوں میں محبت کہتے ہیں، جو خاص طور پر انسان کو ملی ہے۔ کائنات میں کسی دوسری مخلوق کو نہیں ملی۔

ضیا صاحب کا ایک مشہور شعر ہے

گمرہی میں ہے ایک لطف، ضیا! جاؤ، میں راہ پر نہیں آتا

اس شعر کے بارے میں انھوں نے مجھے بتایا تھا:

یہ شعر اس غزل کا ہے جو میں نے زمانۂ مشق میں کہی تھی۔ میں ہائی اسکول سے کالج میں آگیا تھا۔ بچپن پیچھے اور شباب میرے آگے تھا۔ عجیب تذبذب کا عالم ہوتا ہے، زندگی کا یہ موڑ بھی۔ اس کا تجربہ سب کو ہوتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے، جب بغاوت کا جذبہ دل کی کھڑکیوں سے باہر کی طرف جھانکتا ہے۔ مگر ان کھڑکیوں پر کچھ پہرے بھی ہوتے ہیں؛ اور یہاں کھڑا ہو کر کوئی انسان کسی قسم کی ممانعت یا رکاوٹ گوارا نہیں کرتا۔ بس کچھ اسی قسم کا جذبہ اس شعر کی شانِ نزول ہے۔ اور اس کی وضاحت اسی زمانے کی کہی ہوئی ایک نظم "جوانی کا انتباہ ضعیفی کو" میں ملیگا۔ یہ نظم کسی مجموعے میں شامل نہیں البتہ چمنستان، امرتسر میں چھپ چکی ہے۔ بس اس شعر کو اگر مندرجۂ بالا پس منظر میں پڑھا جائے، تو کوئی تضاد کی کیفیت نہیں ہے۔

ضیا نے انگریزی ادبیات میں ایم اے پاس کیا تھا۔ اس لیے ان کی شاعری پر شیکسپیئر، بائرن، کیٹس، شیلی، ورڈز ورتھ کا اثر ہے۔ اس اثر کی نشاندہی "نورِ مشرق" کی بعض نظموں سے ہوتی ہے۔ اس ضمن میں سانیٹوں کے علاوہ "دعوتِ سحر"، "آئینے کے سامنے" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ضیا صاحب کا ایک اور مشہور و مقبول شعر ہے:

کشتی ساحل پر ڈوبی ہے   موجیں ہوتیں، دریا ہوتا

اس شعر کی تضادی کیفیت کی شرح کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا کہ یہ شعر سادہ اور ہموار ہے۔ انسان کی بے بسی سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

زیبا ہوں کو نازیبا، منظر چمنستاں کے   محرومِ عمل نرگس مجبورِ تماشا ہے

اور ڈاکٹر اقبال ہی کا ایک اور شعر ہے:

رازِ حیات پوچھ لو خضرِ خجستہ گام سے   زندہ ہر ایک چیز ہے، کوششِ ناتمام سے

زندگی اور موت کے دونوں مناظر بیک وقت نظر کے سامنے ہوتے ہیں اور ان مناظر کے درپیش انسانی جہد و عمل معرضِ وجود میں آتا ہے۔ افسوس اس کشتی پر ہے جو ساحل پر ڈوب گئی، جہاں جد و جہد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ زندگی کا ثبوت جد و جہد ہی سے ملتا ہے۔ اگر یہی کشتی بیچ دریا کے پہنچ کر ڈوبتی تو زندگی کی دلیل بن جاتی کیونکہ دریا کے بیچ پہنچنے میں کچھ جد و جہد تو کرنی پڑتی، اگرچہ کشتی کو ڈوبنے سے بچانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ موت بہر حال ایک ناگزیر حقیقت ہے۔

(۳)

غزل کے علاوہ نظم بھی ضیا صاحب کے فن کے اظہار کا اچھا نمونہ ہے۔ ان کی ایک نظم "شاعر سجدے میں" ہی انھیں اردو میں مستقل مقام دے کر زندۂ جاوید کر دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ نظم فیض کی نظم "موضوعِ سخن" سے چھ سال قبل

لکھی گئی تھی، اور میتھیو آرنلڈ کے مضمون "نظموں کے موضوع" سے ۷۰ سال بعد کی تصنیف ہے۔ اس نظم کی تازگی، لفظوں کا دروبست، اور خیالات کی روانی ایسی قدرتی ہے کہ قاری نظم کے ساتھ بہ جاتا ہے۔ یہ نظم نیاز فتحپوری کو پسند آئی تھی اور انھوں نے ضیا صاحب کی آفاقیت کے بارے میں لکھا تھا:

ہرچند ضیا صاحب ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے، لیکن بلحاظ فطرت وہ سُبحہ و زنار کی حدود سے بہت بلند زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا نصب العین خارجی حیثیت سے آزادی کا درس دینا ہے اور داخلی حسنِ محض سے متاثر ہونا، جسے ماہرینِ جمالیات خیرِ محض بھی کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ان خصوصیات کو سامنے رکھ کر شاعری کریگا، اس کا کلام یقیناً دلکش ہوگا۔ ضیا صاحب باوجود نوجوان ہونے کے ذہنی حیثیت سے پختہ مغز انِ جنوں کی صف میں جگہ پانے کے قابل ہیں اور اگر ان اکتسابی بات کو نظر انداز کر دیا جائے، جو تجربہ کے بعد ہی میسر آسکتی ہیں، تو "نورِ مشرق" وہ خوبیاں رکھتا ہے جو ایک ذہین نوجوان کے کلام میں پائی جاسکتی ہیں۔

ضیا صاحب نے اپنے استاد سیماب مرحوم سے اس سلسلے میں بہت کچھ سیکھا ہے۔ جتنا اچھا مضمون ہو، وہ اس کے لیے اتنے ہی اچھے الفاظ کا انتخاب بھی اپنے فن کا کمال سمجھتے ہیں۔ وہ وجدانی کیفیت میں مستیِ گفتار کا نام شاعری ضرور سمجھتے ہیں، لیکن وہ شاعری میں طرزِ بیان کو بھی بیحد اہم خیال کرتے ہیں؛ محض خیالات کی بلندی ہی کو شاعری کا وصف نہیں سمجھتے۔ شاعری کی تکمیل ان کے نزدیک اس میں ہے کہ شاعر اپنے ماحول کی حقیر سے حقیر چیز کی پرستش کرنے لگے۔ ان کی نظم "شاعر سجدے میں" کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

اے زمین! اے آسماں! اے زندگی! اے کائنات!

اے ہوا! اے موجِ دریا! اے نشاطِ بے ثبات!

اے پہاڑوں کی بلندی! اے سرد آبشار!
اے گھٹا جھومی ہوئی! اے نغمہ برلب جوئبار!
اے مسرت خیز وادی! اے فضائے کیف ریز!
اے دلِ آبادِ وحشت! اے رگوں کے خونِ تیز!
اے بساطِ ریگ صحرا، بیکس و بے خانماں
اے بگولوں کے مسلسل رقص! اے سیلِ رواں!
اے ستاروں کی چمک! اے گردشِ خورشید و ماہ!
اے سرورِ بیگناہی! اے تقاضائے گناہ!
اے نگاہِ مست و بیخود! مائلِ تخریبِ ہوش
اے نیازِ میکشانِ زیست، نازِ مے فروش!
اے چراغِ آرزو! اے بزمِ ہستی کے شباب!
اے پرِ پروانہ! اے رقصِ نشاطِ کامیاب!
اے حرم! اے دیر! اے مذہب کے اندازِ جبیں!
اے تخیل کی بلندی کے فریبِ بہتریں!
اے قفس میں پلنے والے، بے زبان و بے اماں
اے اسیرانِ محن، مفلس، غریب و ناتواں
اے غمِ ایام! اے فکرِ حصولِ روزگار!
اے خیابانِ عمل! اے بازوئے مصروفِ کار!
اے خمارِ بادۂ دولت میں بیہوش و حواس
اے کہ تم سے ذرہ ذرہ زندگی کا ہے اداس
بے نیازِ مستی جام و سبو کر دو مجھے
اپنے کیفِ مستقل سے اس طرح بھر دو مجھے
میں تمہارے حسن کے سوز و جذب کا ماہر بنوں
دل سے وہ نغمے اٹھیں، جن کے لیے شاعر بنوں

ضیا فتح آبادی

یہ ہیں وہ جذبات و خیالات، موضوعِ سخن جن کے درمیان سے گزر کر ایک انسان حقیقی شاعر بن سکتا ہے، اور یہی وہ تجربہ گاہیں ہیں، جن سے الہام لے کر شاعر جھومتا، گاتا، اقلیم شاعری میں ضیا باریاں کرتا ہے۔ ایسے مناظر خود بلاتے ہیں۔ ذرّے پکارتے ہیں اور اس سے درخواست کرتے ہیں بلکہ اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو اپنی نظم کا موضوع بنائے۔ یہ حقیقت ہے کہ شاعری زندگی کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب کر ابھرتی ہے۔ وہ دام ہر موج سے بچتی ہوئی تہ سے گوہر نایاب ڈھونڈ لانے میں کامیاب ہوتی ہے، اور شاعر وہ سب کچھ کہہ سکتا ہے، جو وہ کہنا چاہتا ہے۔ درد و غم میں ڈوبا ہوا شاعر امید کی دنیا میں جلوہ افروز ہوتا ہے۔ ضیا کی نظم " انقلابِ بہار" کا ایک شعر ہے:

دل سے داغِ سوزِ ناکامی فنا ہو جائیگا۔
اب بہار آئی ہے، عالم گلکدا ہو جائیگا

ضیا صاحب جس طرح خود تصنّع سے پاک اور سادہ ہیں، اسی طرح ان کی شاعری بھی سادہ ہے؛ اس میں کسی قسم کی بناوٹ اور تصنع نہیں۔ ان کا لہجہ غیر فطری نہیں۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں، وہی کہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں الہام کار فرما ہے۔ وہ زندگی میں سب کے برابر کا شریک ہونے کے قائل ہیں۔ ان کی نظم "گھٹائیں" اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہے۔

کافر گھٹائیں ٹھنڈی ہوائیں
جلوہ نما ہیں راحت فزا ہیں
رنگینیوں کا طوفاں ہے برپا
حسن و لطافت عیش اور نزہت
میخوار آئیں ہشیار آئیں
بیتاب آئیں بیخواب آئیں
دیر و حرم کے آئیں فرشتے

مفلس نوا نگر — سب آئیں مل کر
ساغر بھرے ہیں — کوثر بھرے ہیں
میکش اٹھائیں — پی لیں، پلا لیں
ہے عام رحمت — ہنگامِ عشرت
خالی نہ جائیں — کالی گھٹائیں

غرض گیت ہو، غزل ہو، رباعی ہو، نظم ہو، ضیا ہر جگہ ریاکاری اور بناوٹ سے پرہیز کرتے ہیں۔ جو ان کے دل میں ہے، وہی ان کے لب پہ ہے۔
ان کی نظمیں طویل نہیں۔ یہی سبب ہے کہ بالعموم وہ ایک ہی نشست میں مکمل ہو جاتی ہیں؛ دو نشستوں کی ضرورت شاذ و نادر ہی پڑتی ہے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ نظم کہتے ہوئے ذہنی پس منظر بدلنا نہیں چاہیے۔ نظم کی تخلیق کے بعد وہ اکثر کئی کئی مہینے اس میں کمی بیشی کرتے رہتے ہیں۔ ان کی نظم "بو ناروں کا ساز" ۱۹۳۴ء میں کہی گئی تھی۔ پہلے یہ دو بندوں پر مشتمل تھی۔ چار برس بعد انھوں نے اس میں ایک اور بند کا اضافہ کیا۔
اپنے بیشتر ہم عصروں کی طرح ضیا صاحب بھی اقبال سے متاثر ہوئے ہیں۔ ان کی نظم "اگر خدا ہے" اقبال کے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ میرے استفسار پر انھوں نے مجھے بتایا کہ میں نے جب یہ نظم کہی ہے، اس سے بہت پہلے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" پڑھ چکا تھا، مگر اس نظم کا صحیح محرک "شکوہ" نہیں ہے، گو ممکن ہے کہ شکوہ کے تاثرات میرے تحت الشعور میں رہ گئے ہوں۔ دراصل ۱۹۳۵ء میں جب میں ایم اے کا امتحان پاس کر کے لاہور سے سکھوتی ٹانڈہ آ گیا، تو ایک مرتبہ وہاں سے میرٹھ ساغر نظامی صاحب سے ملنے کے لیے گیا۔ باتوں باتوں میں ساغر صاحب نے ذکر کیا کہ ان کے ذہن میں ایک نظم کا موضوع ہے: "اگر خدا ہے"۔ میں اس موضوع سے اتنا متاثر ہوا کہ وہیں میرے ذہن میں نظم کا خاکہ تیار ہو گیا اور میں نے بعد میں نظم بھی مکمل کر لی، جو مقبول ہوئی۔

یوں سمجھیے کہ میں نے یہ نظم ساغر سے چرائی۔
"نورِ مشرق" میں ایک نظم ضیا صاحب نے "محروم سے" لکھی ہے جس میں جناب تلوک چند محروم صاحب کی لڑکی کے جل کر وفات پانے کی طرف اشارا ہے۔ اس نظم کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ میں نے محروم صاحب کو "طلوع" کی ایک جلد بھیجی تھی۔ انھوں نے اس کی بہت تعریف کی۔ وہیں سے ان سے تعلقات شروع ہوئے اور خط و کتابت بھی ہونے لگی۔ ایک خط میں انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ ان کی صاحبزادی نے جل کر خود کشی کر لی ہے۔ ان کے خط میں اتنا درد تھا کہ میں بہت متاثر ہوا اور میرے جذبات نے اشعار کی شکل اختیار کر لی۔ میں نے ان کے خط کے جواب میں یہی نظم محروم صاحب کو بھیج دی۔ ضیا کی تقریباً تمام نظموں کی کوئی نہ کوئی وجہِ تخلیق ہے۔ ان میں واردات، باہمی تعلقات، اور دوسروں کے جذبات کے بارے میں ان کے ذاتی احساسات محرک ہوئے ہیں۔ ضیا صاحب نے محض روایات سے چمٹے رہنے کی غلطی نہیں کی۔ نہ ان کی شاعری محض مشقِ سخن ہی ہے۔ وہ عجیب عجیب موضوعات کے بارے میں سوچتے اور لکھتے رہتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک میں وہ کھلے طور پر شامل تو نہیں ہوئے، لیکن ان کی شاعری پر اس کا اثر ضرور پڑا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی سب سے اچھی نظم "فنکار" ہے۔ اس نظم میں انھوں نے فنکاروں کی عسرت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ یہ نظم جتنی مکمل ہے، اتنی ہی مقبول بھی ہوئی، پوری نظم ملاحظہ کیجیے:

گل و لالہ و نسترن بیچتا ہوں ‌ ‌ ‌ میں کانٹوں کی رنگیں چبھن بیچتا ہوں
زمین و زمان و زمن بیچتا ہوں ‌ ‌ ‌ میں اپنا ضمیر اور فن بیچتا ہوں

میں اپنی متاعِ سخن بیچتا ہوں
خریدو مجھے، جان و تن بیچتا ہوں

روایاتِ ماضی، حکایاتِ فردا ‌ ‌ ‌ تبسم، ترنم، شکایت، مدارا

خموشی، تکلّم، ہنسی، شور و غوغا اجالا، اندھیرا، جوانی، بڑھاپا
نظامِ حیاتِ کہن بیچتا ہوں
خرید و مجھے، جان و تن بیچتا ہوں

سحر خیز کلیوں کی عصمت خرید و رگوں میں مچلتی حرارت خرید و
لبوں کی گلابی کی رنگت خرید و لطافت، مسرّت، محبّت خرید و
نزاکت، ادا، بانکپن بیچتا ہوں
خرید و مجھے، جان و تن بیچتا ہوں

بہاروں کی دلچسپ رعنائیاں لو ربابِ جنوں کی طرب زائیاں لو
عروسِ تخیّل کی انگڑائیاں لو لپکتے شراروں کی اونچائیاں لو
میں اپنا خدا، اہرمن بیچتا ہوں
خرید و مجھے، جان و تن بیچتا ہوں

میں افسانے لکھتا ہوں، کہتا ہوں غزلیں زمانے میں مقبول ہیں میری نظمیں
ادب کو ہیں مجھ سے بہت کچھ امیدیں نہیں پیٹ کی بھوک ہی میرے بس میں
بہ امیدِ یک نان، فن بیچتا ہوں
خرید و مجھے، جان و تن بیچتا ہوں

مری آنکھ کی تم نمی کو نہ دیکھو مرے عالمِ برہمی کو نہ دیکھو
مری زندگی کی کمی کو نہ دیکھو مرے پیکرِ ماتمی کو نہ دیکھو
میں انسانیت کا کفن بیچتا ہوں
خرید و مجھے، جان و تن بیچتا ہوں

شاعری کے سلسلے میں ضیا صاحب ایک ہی راستے اور ایک ہی منزل کے قائل نہیں۔ شاعری تو شاعر کے ہر روز بدلتے ذہن کی پیداوار ہے، جو ایک مرکز پر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ انھوں نے ہر اُس ادبی اور سیاسی تحریک سے اثر لیا ہے، جو براہِ راست ان کی ذات سے متعلق یا قریب رہی ہے۔ جب انھوں نے

شعر گوئی کا آغاز کیا، تو اس میں قدیم رنگ کے ساتھ ساتھ مغربی اور خاص کر انگریزی شاعری کا رنگ بھی شامل تھا۔ یہ سیاسی تحریک کے شباب کا زمانہ تھا، لہٰذا حب الوطنی کا جذبہ بھی ان کے کلام میں کارفرما نظر آتا ہے۔ شروع شروع میں وہ اقبال سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد غالب اور حالی کے نظریات بھی ان کے ذہن میں محفوظ ہو گئے۔ حفیظ جالندھری کے ہلکے پھلکے گیتوں نے بھی انھیں اکسایا۔ اپنے ہمعصروں میں سے احسان دانش اور وفا رانبالوی کی جھلک بھی ان کے کلام میں مل جاتی ہے۔ اختر شیرانی کے سانیٹ اور اندرجیت شرما کے ہندی گیتوں نے بھی انھیں متاثر کیا، اسی لیے ان کے پہلے مجموعۂ کلام میں ہندی گیت شامل ہیں۔ پھر جب حضرت سیماب کا تلمذ اختیار کیا، تو قدرتاً ان پر سیماب اور آگرہ اسکول کا اثر بھی پڑا۔ غرض بقول غالب وہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

جہاں انھوں نے ترقی پسند تحریک سے اثر لیا تھا، وہیں ان کے کلام میں جدیدیت کے اثرات بھی ناپید نہیں۔ غرض بقول سیماب

ہر رنگ کی شراب پیالے میں ہے مرے

یہاں ایک بات واضح کر دینے کے قابل ہے۔ انھوں نے کسی کی اندھی تقلید نہیں کی، بلکہ تمام خارجی اثرات کو اپنے داخلی رنگ میں شامل کر کے اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ انھیں یقین ہے کہ ان کے ہر شعر پر ان کی اپنی ذات کی اور انفرادیت کی چھاپ ہے۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ شاعر اپنے ماحول کی عکاسی کرتا ہے اور وقت کے دھارے کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ شاعری کو زمانے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سبب ہے کہ ضیا صاحب شاعری کو جدید اور قدیم کے خانوں میں تقسیم کرنے کے حق میں نہیں۔ ان کے نزدیک جو کل جدید تھا، وہ آج قدیم ہے؛ اور جو آج

جدید ہے، وہ کل قدیم ہوگا جس طرح انسان کا دائرۂ علم بڑھتا جاتا ہے، اسی
طرح ادب اور شاعری کا کینوس بھی بڑا ہوتا جارہا ہے۔ زندگی کی قدریں
بدلتی ہیں، تو شعر و ادب کی قدریں بھی دھیرے دھیرے بدل جاتی ہیں۔ ترقی پسندی
اور جدیدیت کو انھوں نے کبھی نعروں سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ ان
کے خیال میں وہی ابہام جو زمانۂ قدیم میں اردو شاعری سے خارج کر دیا
گیا تھا، آج پھر جدیدیت کا پرچم ہاتھ میں اٹھائے واپس آگیا جسے تجریدی
فن کہلاتا ہے۔ بھلا وہ شعر جس کا مفہوم فی البطن شاعر ہو، اسے ادب میں
کیوں کر شمار کیا جاسکتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس پرانی دنیا میں کوئی
چیز، کوئی بات بالکل نئی نہیں ہو سکتی۔ البتہ اگر کوئی نئی چیز پیدا کی جاتی
ہے، تو وہ پرانے خیالوں کو نئے ڈھنگ سے کہنا ہے۔ الفاظ کا انداز نیا ہوتا ہے۔
غالب، کو اردو کا سب سے بڑا شاعر منوا چکا ہے۔ اور اکثر اوقات غالب
کو سمجھنے کے لیے بڑی کاوش کی ضرورت ہے، مگر غالب کے یہاں ابہام
نہیں، مشکل پسندی ہے، جس کا ہمارے جدیدیت کے علمبردار ادیب
اور شعرا غلط استعمال کر رہے ہیں۔
قدیم شاعری کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ہر عہد میں کوئی نہ کوئی بڑا شاعر ہوتا
ہے۔ ولی دکنی، جسے اردو شاعری کا باوا آدم خیال کیا جاتا ہے، واقعی بڑا شاعر
تھا۔ پھر میر اپنے زمانے پر چھائے رہے۔ غالب اور ذوق کا زمانہ بھی آپ
کی نظر میں ہے۔ ادھر نظیر اکبرآبادی نے بھی بڑی شاعری تخلیق کی۔ ایک
زمانہ داغ کا تھا۔ پھر ڈاکٹر اقبال اردو شعر پر چھا گئے۔ سیماب صاحب
تو خیر، ان کے استاد تھے اور دراصل وہ انھیں کے نام لیوا ہیں۔ غالب کے
زمانے تک لوگ میر کو سب سے بڑا شاعر مانتے رہے۔ میر کے بعد کا زمانہ جو اب
جاری ہے، دراصل غالب کا زمانہ ہے۔ اور غالب ہر لحاظ سے اردو کا
ایک عظیم شاعر ہے، اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

ان کی مندرجہ ذیل تین آزاد اور جدید نظموں کے بارے میں ضیا صاحب سے بات چیت ہوئی تھی:

آخری بار

تو پریشان نہ ہو، خوف نہ کھا
میں اشارے پہ ترے جان بھی دے سکتا ہوں
یہ بڑا بول نہیں، اس کو حقیقت ہی سمجھ
قیس و فرہاد کی الفت ہی سمجھ
سادہ لوحی پہ نہ جا
میں کہیں دور، بہت دور چلا جاؤنگا
لوٹ کر پھر نہ ادھر آؤنگا
تو بھی اس گھر سے چلی جائیگی، شہنائی کے نغمے سنتی
تازہ خوابوں کے حسیں جال سے ہر دم بُنتی
شمع رہ جائیگی اک سرد دھنتی
تیرے احساس کی گہرائی میں کھو جاؤنگا
اور تارِیک اجالوں میں سکوں پاؤنگا
چاند خاموش ہے، تاروں کا فسوں ٹوٹ گیا
بیتی راتوں کی تجھے یاد دلاؤنگا نہ اب
قول و پیماں کی طرف کوئی اشارہ نہ کرونگا ہرگز
وقتِ گزراں تو گزر جاتا ہے
خود بخود زخم بھی بھر جاتے ہیں
تو کوئی فکر نہ کر
یہ ملاقات، محبت کا یہ حکمِ آخر
ہمیں تسلیم ہی کرنا ہوگا۔

آخری بار ذرا اپنے حسین ہونٹوں پر
مسکراہٹ کی شعاعوں کو بکھر جانے دے
میں اندھیروں میں یہی نور تو لے جاؤنگا
تو پریشان نہ ہو، خوف نہ کھا،
میں کہیں دور، بہت دور چلا جاؤنگا
لوٹ کر پھر نہ ادھر آؤں گا۔

میرا خیال تھا کہ ضیا صاحب نے یہ نظم رابرٹ براؤننگ کی نظم "آخری ہمسفری" (Last Ride together) سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا بھی خیال ہے کہ ممکن ہے، رابرٹ براؤننگ کی اس نظم کا تاثر ان کے ذہن میں اس وقت موجود رہا ہو، جب انھوں نے یہ نظم کہی ہے۔ مگر چونکہ اس نظم کی تخلیق پر اتنا لمبا وقت گذر چکا ہے، اس لیے اب وہ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے، البتہ نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ کامیاب محبت کے حق میں وصل زہر ہلاہل کا حکم رکھتا ہے۔ ان کے خیال میں محبت، جدائی اور تنہائی کے لمحوں ہی میں پلتی ہے اور یہی سبب ہے کہ قیس و فرہاد کی محبت آج بھی زندہ ہے، چاہے اسے دنیا دیوانگی ہی سے کیوں نہ تعبیر کرتی رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس مرکزی خیال کو نظر میں رکھتے ہوئے آپ نظم کا دوبارہ مطالعہ کریں، تو آپ کو اس میں کوئی چیز مبہم نظر نہیں آئیگی۔ یوں سمجھیے کہ لیلیٰ شادی کا لباس زیب تن کیے شہنائیوں کی آوازیں سن کر مایوس بھی ہے اور سہمی ہوئی بھی۔ مگر قیس اسے اپنی سچی محبت کا واسطہ دیتا ہے کہ حوصلہ ہارنے کی ضرورت نہیں اور اسے اپنا ہدیۂ ایثار پیش کرتا ہے کہ میں کہیں دور چلا جاؤنگا اور لوٹ کر پھر کبھی ادھر نہیں آؤنگا تاکہ اس کے دل میں رسوائی کا اندیشہ نہ رہے۔

اسی طرح انھوں نے اپنی نظم "شیریں تلخی" کا پس منظر بیان کرتے ہوئے

بتایا کہ اس نظم کی تخلیق میں ان کے ذاتی تجربے کی بجائے مشاہدے کو زیادہ دخل ہے۔ اکثر لوگوں نے محسوس کیا ہوگا کہ جب وہ کسی جلتی چتا کے پاس کھڑے پسماندہ عزیزوں کو روتے دیکھتے ہیں تو خود ان کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آتی ہیں۔ یہ انسانی ہمدردی اور جذبات کی رقّت کا ثبوت ہے۔ ایک شاعر کے دل میں تو تمام کائنات کا درد ہوتا ہے، وہ اکثر و بیشتر خارجی اور داخلی حدود کو عبور کر کے تخلیقی عمل کا تجربہ کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ کوئی بڑا کلاسیکی شاعر ایسا نہیں جس کا ہر تخلیقی عمل صرف تجربے کے مرحلے سے گزر کر ہم تک پہنچا ہو۔ سب سے اہم چیز جو آپ اس نظم میں محسوس کرینگے وہ اس کا طنزیہ انداز ہے۔ یہ طنز ہے ہمارے موجودہ سماج کے ایک رستے ہوئے زخم پر۔ میں نے کوشش کی ہے کہ صرف اس گھناؤنے زخم کے گھناؤنے پن کو ظاہر کردوں، اس زخم کا علاج میں نے پڑھنے والے پر چھوڑ دیا ہے۔ "فرار" کا پس منظر یہ ہے کہ جب انسان جنم لیتا ہے تو وہ دنیا کی تازگی اور اس کے رنگ و بو میں کھوجاتا ہے مگر یہ کیفیت دیر تک نہیں رہتی۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہے، اسے حادثاتِ زندگی سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے، اور رفتہ رفتہ اس پر یہ راز منکشف ہوجاتا ہے کہ زندگی میں روشنی کم اور تاریکی زیادہ ہے۔ اور جب یہ بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آجاتی ہے، تو وہ زندگی سے بچ نکلنے کی سوچنے لگتا ہے اور آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ زندگی کا یہ وہ مرحلہ ہے، جس سے ہر ذی نفس کو گزرنا پڑتا ہے۔

کامیاب نظموں کے علاوہ ضیا صاحب نے اردو شاعری کو بیحد حسین گیتوں سے بھی مالا مال کیا ہے۔ ضیا کے گیت آسان اور رسیلی زبان کے علاوہ بہترین سرودی شاعری کے نمونے بھی ہیں۔ اس میں انگلیں اندر جیت

ثریا، مقبول حسین، میرا جی، عظمت اللہ خان وغیرہ کی ہندی نما اردو شاعری نے بھی متاثر کیا ہے۔ اس حبت بھرے گیتوں میں چاہے وصل کا بیان ہو، یا فراق کا قصّہ، پیا کے پردیس جانے کا ذکر ہو یا محبوب کے روپ کی بات، یہ گیت آفاقی اثرات کے حامل ہیں۔ ان میں رس اور لوچ بھی ہے، پیار کی رنگینی بھی! ان میں ہجر کا درد بھی ہے، وصال کی چاشنی بھی۔ گیتوں کے علاوہ ضیا نے کامیاب قطعات اور رباعیات بھی کہی ہیں۔

دورِ حاضر میں سب سے پہلے ضیا صاحب ہی نے قطعات کتابی صورت میں "طلوع" کے نام سے شائع کیے۔ اختر انصاری کی آبگینے، نریش کمار شاد کی قاشیں اور احمد ندیم قاسمی کا مجموعہ کلام 'رم جھم' بعد کی مطبوعات ہیں۔ "طلوع" کے قطعات حسنِ بیان کے علاوہ نفسِ مضمون کی بلندی کے پہلو سے بھی نمایاں ہیں۔ وہ محرابِ شاعری کے چراغ ہیں؛ "طلوع" سے ادب کی کرنیں جھانکتی ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

جھٹپٹا تن تن، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا	آسمان پر خرام بادل کا
جان و دل کو خرید لیتی ہے	ایسے عالم میں بانسری کی نوا
اپنی دھن ہی میں مست رہنے دو	زحمتِ اضطراب سہنے دو
میرے بارے میں دوستو! تم سے	کوئی کہتا ہے کچھ، تو کہنے دو
واقفِ عیش و غم شناسا ہے	نور و ظلمت کا آئینہ سا ہے
حاملِ وسعت و نشیب و فراز	دل کی دنیا، عجیب دنیا ہے
ابر چھایا ہے آسماں پر، ضیا!	اور کیف آفریں ہے بادِ صبا
آرزوئیں ہیں اضطراب انگیز	کیا بتاؤں کہ چاہتا ہوں کیا!
شمعِ احساس جلتی رہتی ہے	آگ دل میں سلگتی رہتی ہے
لب پہ آتا نہیں مگر شکوہ	چپکے چپکے پگھلتی رہتی ہے

ضیا کی شاعری فن اور فکر کا حسین امتزاج ہے۔ ہم جب کبھی اس بحرِ بیکراں میں غوطہ لگاتے ہیں، ہمیں اس میں سے خیالاتِ تازہ اور تاثراتِ نو کے جواہر ہاتھ لگتے ہیں، جن سے مسرّت اور لذّت کا احساس پیدا ہوتا ہے دل میں جاگتا ہے۔ ان کی نظم "روح کا پیمانہ" ملاحظہ ہو:

بھر دے میرا جام، اے ساقی! بھر دے میرا جام
آیا ہوں میں دور سے ساقی! بھر دے میرا جام
کیفیت اور نور سے، ساقی! بھر دے میرا جام
نور وہ، جس سے روشن دل کا کاشانہ ہو جائے
کیفیت وہ جس میں ڈوب کے ہستی میخانہ ہو جائے
زیست جسے کہتی ہے دنیا، مستی کا ہے نام
بھر دے میرا جام

مشرق سے وہ سورج ابھرا، پہنے زریں تاج
چاند ستارے چھوڑ کے بھاگے اپنا اپنا راج
بیداری کے نغموں سے بیتاب ہوا ہر ساز
تو بھی تو، اے میرے ساقی! دے مجھ کو آواز
میری امیدیں بھی کیوں رہ جائیں تشنہ کام!
بھر دے میرا جام

بیخود ہے نشّے میں رنگ و بو کے کل گلزار
فرق نہیں ہے مطلق کوئی، گُل ہو یا ہو خار
دور کہیں اک گلشن ہے، اس گلشن سے بھی خوب
دل تو دل، ہو جاتی ہیں جس سے روحیں مغلوب
اس گلشن کے بھید بتا کر، مجھ کو کر لے رام
بھر دے میرا جام

بادل کرتے ہیں گردوں پر بیتابی کا رقص
خاک کا ہر ذرّہ کرتا ہے شادابی کا رقص
بھول چکے ہیں اکثر تجھ کو، ہو کر ناامید
ناامیدی ہی تو ہے بربادی کی تمہید
مجھ کو بھی اس طرح نہ رکھ تو، نومید و ناکام

بھر دے میرا جام

پی کر میں بیخود ہو جاؤں، گاؤں تیرے گیت
میری جیت، حقیقت میں، ہے ساقی! تیری جیت
دیکھ کے میری مستی، دنیا پھر مستی میں آ جائے
اس عالم میں مجھ کو کھو دے اور تجھے پا جائے
مجھ سے غفلت کیوں، میں تو ہوں رندِ مے آشام

بھر دے میرا جام

مدت سے تیرا میخانہ ہے بے رنگ و نور
کیا اس کا انجام تجھے ایسا ہی تھا منظور!
ہار کے بیٹھے ہیں اک گوشے میں سارے میخوار
جو بھی ہے اس محفل میں، ہے مستی سے بیزار
لیکن مجھ کو دیکھ کہ میرا شوق نہیں ہے خام

بھر دے میرا جام

تیرے ہی یہ بندے ہیں، سب باہوش و بیہوش
زیبا نہیں دیتا ہے تجھ کو ہو جانا خاموش
اے کیف و مستی کے خالق! مستی کر تقسیم
پھر ان تشنہ روحوں کو دے تسکیں کی تعلیم
لا اپنی وہ خاص صراحی، رنگین و گلفام

بھر دے میرا جام، اے ساقی! بھر دے میرا جام

اپنی یہ نظم خود ضیا صاحب کو بھی بیحد پسند ہے۔ یہ "نورِ مشرق میں" شامل ہے۔ اس کے علاوہ قبلہ سیماب مرحوم کو ضیا صاحب کی نظم "فطرت کا شاہکار" بہت پسند تھی۔ "گردِ راہ" کی یہ غزل بھی ضیا صاحب کی پسندیدہ غزلوں میں سے ہے۔

دنیا مری نظر سے تجھے دیکھتی رہی پھر میرے دیکھنے میں بتا، کیا کمی رہی

"نئی صبح" میں مطبوعہ غزل : تم چلے آئے تو ساری بیکلی جاتی رہی، جب پہلی مرتبہ "بیسویں صدی" میں چھپی، تو اس پر بڑا حوصلہ افزا تعریفی نوٹ ادارے کی طرف سے شریکِ اشاعت تھا۔

اپنی پسندیدہ نظموں، غزلوں کے بارے میں ضیا صاحب نے بتایا کہ "نورِ مشرق" میں مطبوعہ نظم "اگر خدا ہوتا" دو تین جریدوں میں نقل ہوئی تھی۔ جب وہ چند ماہ کے لیے کانپور میں تھے، ایک صاحب سے انھیں ملاقات کا موقع ملا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کا نام ضیا فتح آبادی ہے، تو وہ کہنے لگے کہ میں نے جب آپ کی نظم "بغاوت" (نئی صبح) "ادبی دنیا" (لاہور) میں پڑھی، تو مجھے اتنی پسند آئی کہ میں نے اپنے امتحان میں ایک سوال کے جواب میں اس کا اقتباس دیا تھا۔ اسی طرح ان کی نظمیں "فنکار" (نئی صبح) اور "ہجر" (گردِ راہ) بھی بہت مشہور اور مقبول ہوئیں۔ "ڈبونے سے کیا فائدہ ہے" اور "منزل سے آئے ہیں" (گردِ راہ) غزلوں کی بالترتیب ابر احسنی مرحوم اور جناب اعجاز صدیقی نے بہت تعریف کی تھی۔ ان کی پہلی تصنیف "طلوع" کو مرحوم ناوک حمزہ پوری مرحوم اور منصور احمد نے بیحد سراہا۔

مجموعی طور پر ضیا صاحب ان شعرا میں سے ہیں، جن کی شاعری اقلیم شعر و سخن میں مدتوں ضیا بار رہیگی۔ نظم ہو یا غزل، وہ ہر جگہ کامیاب ہیں۔ ان کے پاس وہ مشاہدہ ہے، جو نقاش کی آنکھ رکھتا ہے۔ اور ان کی شاعری میں کسی خوش گلو کا احساسِ ترنم بھی ہے۔ ان کی شاعری میں پختہ جذبات

دردِ انسان اور دل کا کرب ہے۔ یہاں حسن و شباب کے نغمے بھی ہیں اور زندگی کی عکاسی بھی اور حب الوطنی بھی۔ غرض، وہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کے شاعر ہیں

(۴)

میں یہ مضمون ان آرا پر ختم کرتا ہوں، جو مختلف اصحابِ فکر و نظر نے ضیا صاحب کے کلام کے بارے میں وقتاً فوقتاً ظاہر کی ہیں۔

(۱) مرحوم جناب تلوک چند محروم نے ضیا صاحب کی پہلی تصنیف "طلوع" دیکھ کر کہا تھا:

> ابتدا میں آپ کے کلام کی انتہائی پختگی دیکھ کر مجھے بہت مسرت ہوئی ع
> سالے کہ نکو است از بہارش پیدا
> قطعات اور رباعیات کی سلاستِ زبان، ندرتِ خیال، حسنِ تخیل دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی شاعر کی اوّلین تصنیف ہے۔ دعا ہے کہ ایشور آپ کو دنیائے ادب میں حسنِ قبول کی دولت سے مالا مال کرے۔

(۲) علامہ نیاز فتحپوری نے ان کے مجموعۂ کلام "نورِ مشرق" سے متعلق اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کیا تھا:

> ہر چند ضیا صاحب ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں، لیکن بلحاظِ فطرت وہ سُبحہ و زنّار کی حدود سے بہت بلند زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا نصب العین خارجی حیثیت سے آزادی کا درس دینا ہے، اور داخلی حیثیت سے حسنِ محض سے متاثر ہونا، جسے ماہرینِ جمالیات 'خیرِ محض' بھی کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ان خصوصیات کو سامنے رکھ کر شاعری کریگا، اس کا کلام دلکش ہوگا۔ ضیا صاحب باوجود نوجوان ہونے کے ذہنی حیثیت سے پختہ مغزانِ جنون کی صف میں جگہ پانے کے قابل ہیں؛ اور

اگر ان اکتسابات کو نظر انداز کر دیا جائے جو تجربے کے بعد ہی میسّر آسکتے ہیں، تو یہ مجموعہ تمام وہ خوبیاں رکھتا ہے، جو ایک ذہین نوجوان کے کلام میں پائی جا سکتی ہیں۔

(۳) شاہد احمد دہلوی نے ان کے بارے میں لکھا تھا:

ضیا صاحب خوش فکر اور جدّت طراز شاعر ہیں۔ وہ کسی مشہور شاعر کی پیروی، تقلید یا نقّالی نہیں کرتے، بلکہ خود اپنا ایک ڈھنگ، ایک اسلوب رکھتے ہیں۔ مغربی شاعری کے مطالعے نے ان کے خیال کے لیے نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ضیا کے اشعار میں زندگی کے آثار اور پیامِ بیداری ہے۔ انھیں پڑھ کر رونے یا سونے کو جی نہیں چاہتا۔

(۴) پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے ضیا صاحب کے بارے میں فرمایا تھا:

"نورِ مشرق" بہت دلچسپی سے پڑھا، اور اس کے کچھ حصے تو بار بار پڑھے اور اب بھی پڑھ کر لطف اندوز ہوتا ہوں۔ سانیٹوں اور گیتوں میں آپ کی کامیابی نے مجھے خاص طور پر متوجہ کیا۔ کئی مقامات پر مفکّرانہ اور شاعرانہ انداز کے امتزاج نے مجھے بہت لطف دیا۔ آپ کی شاعری بالکل نقّالی یا تقلید نہیں۔ اس میں خلوص ہے: اور کہیں رنگین سادگی ہے، کہیں سادہ اور دلکش رنگینی۔ ترنّم اور روانی اور ایک حسّاس سلامت روی اس کی خاص صفتیں ہیں۔ مشرقی اور مغربی یا یوں کہیے کہ مشرقی اور جدید اسپرٹ یا مزاج بہت اچھی طرح سموئے گئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ عمق، بلندی اور شاعری کے ماورائی صفات جتنے اس مجموعے میں موجود ہیں، اس سے زیادہ کی توقع آپ کے آئندہ

کارناموں میں کی جا سکتی ہے۔ یہ آہنگِ جنوں اور بھی پختہ اور تیز ہو جائے تو جس رنگ کا آغاز آپ سے ہوا ہے، اس کی تکمیل ہو جائے۔

(۵) حکیم آزاد انصاری مرحوم نے ان کے کلام کا تعارف لکھتے ہوئے لکھا تھا:

یہ مجموعہ دورِ حاضر کی ترقی یافتہ شاعری کا ایک دلچسپ اور نظر نواز مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں سلاستِ زبان اور بلاغتِ بیان کے جا بجا ایسے نادر نمونے نظر آتے ہیں، جن کی تعریف کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ اس مجموعے کی اکثر نظموں میں زندگی کے اکثر پہلو اس خوبصورتی سے روشنی میں لائے گئے ہیں کہ ہمارا اردو ادب اس پر فخر کر سکتا ہے۔

جناب ضیا صاحب ایک تو تعلیم یافتہ اور نوجوان شاعر ہیں اور نئی تعلیم نے اردو میں جس قسم کا نیا رنگِ شاعری پیدا کر دیا ہے، وہ ان کے کلام میں بھی بڑی حد تک پایا جاتا ہے۔ اگرچہ ابھی آپ کی شاعری پورے بلوغ کو نہیں پہنچی، مگر آثار کہہ رہے ہیں کہ آپ ایک نہ ایک دن پورے اوجِ شاعری پر پہنچ کر دم لینگے۔

(۶) جناب جوش ملیح آبادی نے ان کے بارے میں لکھا تھا:

مہر لال صاحب ضیا فتح آبادی کو میں کئی وجوہ سے عزیز رکھتا ہوں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ان کا قلب صاف اور وسیع ہے، جسے سُبحہ و زنّار کی احمقانہ کشاکش سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ وہ مادرِ وطن کے سچے پرستار ہیں، اور ہندستانی کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر چند وہ ابھی نوجوان ہیں، مگر ان کے تغزّل میں اُس پختگی در رسید گی، کے وہ علامات پیدا ہو چکے

ہیں، جو تجربہ کار پیرانہ سالی کا حصّہ ہوتے ہیں۔ ہر وہ شخص جس کا دماغ اس سے زیادہ سن رسیدہ ہو، قابلِ محبت وعقیدت ہوا کرتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ ان چند گنتی کے شعرا میں سے ہیں، جنھیں بخت کی یاوری اور قدرت کی فیاضی سے شاعری کا صحیح راستہ معلوم ہو گیا ہے .... وہ جو کچھ مطالعہ یا محسوس کرتے ہیں، اسی کو کہتے ہیں، اور اس انداز سے کہتے ہیں، جو دلنشین ہوتا ہے۔

(۷) پاکستان کے مشہور جدید نقاد وزیرآغا اپنی تصنیف "اردو شاعری کا مزاج" میں گیت کے موضوع پر لکھتے ہوئے ضیا صاحب کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

گیت کے سلسلے میں حفیظ، ساغر اور تاثیر کے بعد اگلا اہم نام میراجی کا ہے۔ دراصل میراجی سے اردو گیت کے ایک بالکل نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور میں اردو گیت نے ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کی اور خود کو نئے امکانات سے روشناس کیا۔ اس تحریک کے علمبرداروں میں میراجی کے علاوہ اندرجیت شرما، آرزو لکھنوی، قیوم نظر، حفیظ ہوشیارپوری، مجروح سلطانپوری، ضیا فتح آبادی، امیر چند قیس، مقبول حسین احمدپوری، وقار انبالوی، بسنت سہائے اور لطیف انور کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

(۸) پنڈت بالمکند عرش ملسیانی نے ان کی تصنیف گردِ راہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

ضیا صاحب بڑے مشاق اور خوشگو شاعر ہیں۔ ان کی آزاد نظمیں خلافِ توقع ان کی پابند نظموں سے بھی بہتر ہیں۔ سارے کا سارا کلام معیاری ہے، اور ان کی ہمہ جہت طبیعت کا آئینہ دار۔

(۹) ڈاکٹر منوہر سہائے انور مرحوم کا ارشاد ہے:

جناب ضیا فتح آبادی کی ذاتِ جامع صفات ان کے کلام میں پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آسکتی ہے:

وہ سادہ بھی ہیں اور پُرکار بھی   وہ بیخود بھی ہیں، اور ہشیار بھی

وہ سادہ الفاظ میں دقیق نفسیاتی حقائق بیان کر جاتے ہیں، اور وطنیت کے پرستار رہنے کے باوجود آفاقیت سے رشتہ جوڑ لینے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتے۔ ان کا کلام انسانیتِ کبریٰ کی اعلیٰ قدروں کا حامل ہونے کے ساتھ ہی حسن پرستی اور عاشق مزاجی کے شورانگیز جذبات کا بھی مظہر ہے۔ ان کی نظمیں دلکش اور غزلیں دلکشائی کے لحاظ سے مقبولِ خاص و عام ہیں۔ قطعات و رباعیات میں طلاقت اور جزالت کا امتزاج قابلِ دید ہے۔

(۱۰) جناب ساغر نظامی نے ضیا صاحب کا ادبی دنیا میں تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا:

آئیے آپ کو گلزارِ ادبیات کے اس عندلیبِ خوشنوا کے گیت سنائیں۔ جس کا دل اچھوتے نغموں کی ایک لازوال دنیا ہے، اور جس کی خاموشی ایک عظیم گویائی کا مقدمہ معلوم ہوتی ہے.... روحانی طور پر ان کے قطعات صحیح اور فنی طور پر اغلاط سے پاک ہیں، اور اکثر جگہ وہ شیرینی و بلندی پائی جاتی ہے، جو کامیاب شاعر کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہے۔ وہ گوارائی اور استغنا بھی ان کے

قطعات کی روحِ رواں ہے، جو شاعر کا اصلِ اصول ہوتا ہے۔ وہ انسان کو پیغامِ عمل بھی دیتے ہیں، اور رہبانیت کے خلاف ہیں۔ زندگی سے متعلق ان کا مشاہدہ نہایت صحیح اور روشن ہے۔ کہیں کہیں فنا کی تعلیم بھی ہے ....

بہر حال مجموعی طور پر ہمارے شاعر کی یہ سعی مستحسن ہے، اور ہم کو کشادہ دلی سے اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے کیونکہ ہمیں پنجاب کے مضافات میں رہنے والے ضیا کو آفتاب کی شکل میں دیکھنا ہے۔

(۱۱) ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے ضیا کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر کیا تھا:

انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اچھی قدروں کی اشاعت کی ہے ..... زندگی کی تلخیوں کو کم کر کے محبت کے جذبے کو ابھارا ہے ..... وہ آسودگی بخش بھی ہے، اور ایک حد تک نظر افروز بھی — اس میں اظہارِ قوت بھی ہے، اور لطافت بھی۔ ان کے یہاں بیانِ شوق کی بیباکی کے ساتھ انسانیت کی حنابندی کا نرم نرم احساس بھی ہے۔ ان کے یہاں جذبات کی گھن گرج نہیں ہے، نفاست اور نزاکت ہے۔ اسی لیے ان کے لب و لہجہ میں دل آسائی اور مٹھاس ہے، اور ان کی شاعری میں پُرکاری اور سرشاری ہے۔ ضیا صاحب شاعری میں بےراہ روی پسند نہیں کرتے۔

(۱۲) تذکرۂ شعرائے پنجاب میں پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر (نسیم رضوانی) نے ضیا کے بارے میں یوں لکھا تھا:

کلام میں برجستگی اور موزونیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لیکن غزل کی نسبت نظم کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ آپ کے قطعات ایک مخصوص رنگ کے حامل ہیں، بلکہ صحیح طور پر خود ضیا کے جذبات کا صادق عکس۔ ان کی شاعری بیشتر انفرادی ہے۔

(۱۳) ادبی دنیا کے مدیر جناب منصور احمد نے لکھا تھا:

ضیا ایک حقیقی شاعر ہیں، اور جو کچھ انھوں نے لکھا ہے، اسے انھوں نے محسوس کیا ہے، اور سوچا بھی ہے۔ اسی لیے ان کے کلام میں سنجیدگی اور اثر کی فراوانی ہے۔ ان کا ذوق بلند ہے، اور زبان پاکیزہ اور صحیح ہے...... ضیا کی شاعری ایسی ہے کہ اس میں اجتماعیت کی بجائے انفرادیت زیادہ ہے۔

(۱۴) پروفیسر سیّد وقار عظیم مرحوم نے ان کے بارے میں "آجکل" میں لکھا تھا:

ضیا فتح آبادی ان چند شعرا میں سے ہیں جنھوں نے شاعری میں ذوقِ نظر کے سوا کسی اور چیز کو اپنا رہبر نہیں بنایا۔ غزلوں میں بھی اور نظموں میں بھی، انھوں نے کبھی زمانے کی ہوا کے ساتھ چلنے کی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ ان کی نظموں کے اس مجموعے کی خصوصیّت بھی یہی ہے کہ وہ ان کے ذاتی مشاہدات و محسوسات کا ترجمان ہے۔ اس میں نہ شاعری کے نئے تجربے کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نہ قدامت کی کورانہ تقلید ہے۔ شروع سے آخر تک بس ایک چیز ہے: اپنی ذات اور زندگی کے ساتھ خلوص۔ خارجی زندگی اور داخلی کیفیتوں کو سمو کر جو شاعری کی جائے، وہ اپنے ساتھ بھی انصاف ہے، اور دوسروں کے ساتھ بھی ―― "نورِ مشرق" اسی انصاف اور خلوص کا نمونہ ہے۔

(۱۵) جناب گوپی ناتھ امن نے ان کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے:

ضیا صاحب نے اپنے استاد جناب سیماب اکبرآبادی کی طرح قدیم و جدید دونوں رنگوں کو ملایا ہے، اور کامیابی سے ملایا ہے۔ وہ رنگِ جدید میں کہتے ہیں، تو فن کی پابندیوں کو خیرباد نہیں کہتے۔ ان کے کلام میں روانی بھی ہے، اور کیف بھی! جدّت بھی ہے اور

پختگی بھی۔

(١٦) جناب گنپت سہائے سریواستو نے حال ہی میں ان کے بارے میں یوں لکھا ہے :

حال آنکہ ضیا صاحب خصوصاً ایک نظم نگار شاعر ہیں، مگر ان کی غزلیں بھی فلسفیانہ تخئیل، جدّتِ مضامین، اور دلکش پیرایۂ بیان کی حامل ہوتی ہیں۔ زبان کی سادگی و سلاست کے ساتھ ساتھ کلام میں روانی اور صفائی اور مضامین کی پاکیزگی و شستگی پائی جاتی ہے۔ آپ ہر لحاظ سے اردو کے مایۂ ناز شعرا میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔

ویدپرکاش شرما

ضیا فتح آبادی
کی شاعری میں
ترقی پسند عناصر

ضیا فتح آبادی کے کلام کے چار مجموعے میری نظر سے گزرے ہیں جن میں سے دو بحیثیت مجموعی رومانٹک نظموں اور قطعوں کی ذیل میں آتے ہیں۔ لیکن "نئی صبح" اور "گردِ راہ" کی بیشتر نظمیں انھیں ترقی پسند شعرا کی اس صف میں لے آتی ہیں، جو ہمارے چند ایسے شعرا کے لیے مخصوص ہے، جن کے ہاں زندگی کی قدروں کو استوار کرنے والا مواد فنکارانہ ہیئت کی مدد سے پیش کیا جاتا ہے۔ ضیا ان شعرا میں سے ہیں، جو فن میں دسترس حاصل کرنے کے لیے علم اور ریاضت دونوں کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد اپنی منزلِ مقصود پر پہنچتے ہیں۔ "طلوع" ان کی پہلی کتاب ہے۔ قطعہ خاصی مشکل صنفِ شاعری ہے۔ چار مصرعوں کا چھوٹا سا کینوس، قوافی کی بندش اور غزل کی سی خوبصورت اور اشاریت سے بھرپور نگارش، یہ سب باتیں قطعے کو مشکل تر بنا دیتی ہے۔ جو شاعر اپنا اوّلین مجموعۂ کلام ہی ان گلہائے رنگا رنگ کی شکل میں پیش کر کے سخن فہم حلقوں سے دادِ تحسین حاصل کر چکا ہو، اس کی کامیابی میں کیسے شک ہو سکتا ہے۔

دور میں جامِ ارغوانی ہے ۔۔۔ صحبتِ عیشِ جاودانی ہے
کیا ڈراتا ہے مجھ کو، اے واعظ! ۔۔۔ میں جواں ہوں، مری جوانی ہے۔

"میری جوانی ہے" یہ سہ لفظی جملہ قطعے کے بقیہ ساڑھے تین مصرعوں کو قطعہ بنا دیتا ہے۔ ہو بہو اسی تکنیک مگر مختلف مضمون کا ایک قطعہ ملاحظہ کیجیے:

جب جہاں محو خواب ہوتا ہے ۔۔۔ بیچ کر عقل و ہوش سوتا ہے
موت دنیا پہ دیکھ کر طاری ۔۔۔ میں کبھی روتا ہوں، دل کبھی روتا ہے

ترقی پسندی کے عناصر اس قطعے میں صاف دکھائی دیتے ہیں۔ زندگی کو پیار کرنے والا حساس دل جب دنیا والوں کو زندگی سے بے پروا دیکھتا ہے، تو اس کا رونا ایک لازمی امر ہے۔

صبح مشرق سے آفتاب آیا ۔۔۔ دورِ بیدار ہم رکاب آیا
خوابِ غفلت سے آنکھ کھول ضیاؔ! ۔۔۔ دیکھ دنیا میں انقلاب آیا

یہ قطعہ ضیا صاحب کے لاشعور میں پلتی ہوئی اس چنگاری کی غمازی کرتا ہے جو ان کی دوسری نظم "نئی صبح" میں شعلہ بن کر رقص فرما ہوئی ہے:

فائدہ کیا تمھارے ڈرنے سے! ۔۔۔ رات دن آہِ سرد بھرنے سے!
ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھے ہو ۔۔۔ کچھ نہیں ہوتا، کچھ نہ کرنے سے

اس قطعے کی سادہ مگر ٹھوس حقیقت انسان کی بجھی ہوئی، پسی ہوئی، دبی ہوئی، روح کو آمادہ بعمل کرنے میں کتنی پُر اثر ہے، اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

ضیا کی دوسری تصنیف "نورِ مشرق" میں نظموں کے علاوہ چند گیت اور سانیٹ بھی ہیں۔ کتاب کا زیادہ حصہ روایتی رومانی شاعری کی شاہراہ پر بڑھتا اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ لیکن اس روایتی شاعری پر بھی ضیا صاحب کی انفرادیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ نظموں میں چھوٹی چھوٹی بحروں کی کئی پیاری نظمیں ہیں۔ مثلاً "ابر بہار"، "گھٹائیں"، "بسنت کا ترانہ" اور بحر طویل کی نظمیں بھی جیسے "بوندوں کا ساز"، اگرچہ بعض جگہ انھوں نے ایک سے زیادہ بحور کے حسین امتزاج سے نظم کے تاثر کو بڑھایا ہے۔

اس تجربے میں ان کی فنی صلاحیت بہت مددگار ثابت ہوئی۔
"اگر خدا ہے" میں وہ نہایت دلکش اندازِ بیان اور خوبصورت اسٹائل میں دنیا کے غم و اندوہ کو پیش کرتے ہیں۔ نظم کے دوسرے حصے میں شاید انھوں نے علامہ اقبال کے تجربے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ "شکوہ" کے بعد "جواب شکوہ" لکھنے کی بجائے انھوں نے ایک ہی نظم میں اپنا پہلو بچانے کی کوشش کی ہے۔
مجھے ڈیوک آف ونڈسر، پر کہی ہوئی کئی نظمیں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے، لیکن محبّت کی خاطر شاہی تخت و تاج کو ٹھکرا دینے والی اس عظیم ہستی کو جس خوبصورت انداز اور بھرپور موثر طریقے سے ضیا صاحب نے پیش کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ لوگ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا کی محبّت کے قصّے سن سن کر تنگ آچکے تھے، اور وہ شاعروں کو قدرے جنونی تصور کرنے لگے تھے جو لکیر پیٹے جا رہے تھے۔ بات یہ ہے کہ یہ پارینہ داستانیں اپنی تمام دلکشی کے باوجود ہمارے عہد سے بہت دور تھیں۔ محبوب کے لیے قربانی دینے والے عالی حوصلہ لوگ کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے، لیکن ڈیوک آف ونڈسر کے ایثار نے ایک مرتبہ پھر دنیا کو محبّت کی بے پناہ قوت کا تازہ ثبوت بہم پہنچا دیا۔ :

زمانہ قیس کی تاریخ کو افسانہ سمجھا تھا	محبّت کرنے والوں کو فقط دیوانہ سمجھا تھا
یقیں آتا نہ تھا فرہاد کے ایثار پر اس کو	ہنسی آتی تھی شاعر کے نشاطِ کار پر اس کو
مگر تو نے یہ ثابت کر دیا افرادِ عالم پر	کہ ہیں موجود اب بھی مٹنے والے شوقِ پیہم پر

"نئی صبح" میں قطعات، غزلیں، پابند نظمیں اور آزاد نظمیں، سبھی کچھ شامل ہے۔
بڑھتی ہوئی زندگی کی نئی اقدار جو ضیا کی پہلی دو کتابوں (طلوع اور نور مشرق) میں ابر آلودہ آسمان پر گاہے ماہے چمکنے والی بجلی کی مانند تھیں، اس مجموعے میں پوری شدت اور تابانی کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔ زندگی سے متعلق ان کے نظریے میں کس حد تک حیرت انگیز تبدیلی رونما ہو چکی ہے، اس کا اندازہ "طلوع" اور "نئی صبح" کے دو قطعات سے لگایا جا سکتا ہے:

ہے غلامی سے اسیری اچھی　　اور امیری سے فقیری اچھی
اس جوانی سے تو پیری اچھی (طلوع)

مہکا ہوا گلزار، جوانی میری　　اک ابرِ گہربار، جوانی میری
پرجوش ہے جذبۂ عمل سے ہر دم　　ہے کسل سے بیزار، جوانی میری (نئی صبح)

انسانی ذہن جب قدرت کی بے پناہ مگر اندھی طاقتوں کو سر کرنے کے لیے جد وجہد کا قائل ہو جاتا ہے، تو وہ راضی برضا ہونے کی بجائے جذبۂ عمل سے اپنی روح کو سرشار کرنے لگتا ہے، اور کسی غائبانہ قوت کی بخشش کے سامنے اپنا دامن پھیلانے کی جگہ اپنی قوتِ بازو کے بھروسے زندگی کو حسین بنانے کی سعی میں جُٹ جاتا ہے۔ جذبۂ عمل بیشک مبارک ہے، لیکن یہ اس وقت تک انسانی ذہن کو آمادۂ عمل نہیں کرسکتا، جب تک اس میں اس جہان کو اپنا جہان، اس زمین کو اپنی زمین اور اس دنیا کو اپنی دنیا سمجھنے کی اہلیت نہ پیدا ہو جائے۔ اس ذہنی ارتقا کے بعد کسی فنکار کے لیے بھی محض تصوراتی حسن و عشق کی وادی میں اپنے آپ کو گم کردینے کی خواہش باقی نہیں رہ سکتی۔ اس لیے جہاں کسی زمانے میں ضیا آرام کی عدم موجودگی کی وجہ سے پیری کو جوانی پر ترجیح دیتے تھے، اب اسے عمل اور جد وجہد کی سنگلاخ راہوں پر ڈال رہے ہیں۔ اس ذہنی ارتقا میں ماحول کے اثر سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن محض ماحول ہی کافی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا، تو آج ہمارے تمام شعرار ضیا صاحب کی طرح زندگی کی ترقی پسند قدروں کو اپناتے۔ ماحول کے ساتھ شاعر کی قوتِ مشاہدہ، اس کی دوررس نظر، اور تجربہ کرنے کی اہلیت کی موجودگی بھی اشد ضروری ہے۔ ماحول اثر کی چبھن کو محسوس کراسکتا ہے، لیکن اس کی توجیہہ سے معذور ہے۔ اس لیے جملہ علوم کا وسیع مطالعہ، انسانی تاریخ سے کما حقہٗ واقفیت سماجی رشتوں کے بارے میں پوری سوجھ بوجھ اور پھر ایک حساس دل، ان کی ضرورت ہے۔ ضیا کے ذہنی رجحانات میں اتنی زبردست تبدیلی سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ان کا دامن ان خصوصیات سے مالا مال ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ ہمارے پرانے شعرا نے بھی زندگی کی تلخیوں کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔ لیکن چونکہ ان کے زمانے میں زندگی کا اشتراکی شعور پوری شدت سے رُونما نہیں ہوا تھا، اس لیے زندگی کو حسین بنانے کا جذبہ تشنۂ تکمیل رہا۔ ذرائع آمدو رفت کی دقتیں، تحصیل علم اور مطالعے کے رستے میں اقتصادی، سماجی اور سیاسی رکاوٹیں، جمہوریت کے واضح تصور کا فقدان، ان سب باتوں نے ان کے نظریۂ حیات کی علمی حیثیت کو بہت محدود کر دیا تھا۔ اس میں ان کا بھی قصور نہیں تھا۔ آج کے سماجی طور پر باشعور فنکار بھی ان حالات میں ان سے زیادہ شعور پیدا نہ کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حسن و جمال کی متلاشی نگاہیں زیادہ تر محبوب کی خوبصورتی ہی کا طواف کرتی رہیں۔ ان کی بیشتر ذہنی جدوجہد کا مقصود اپنے نجی غموں کی الجھنیں سلجھانا تھا۔ لیکن جب سماجی شعور حالات کی آگ میں تپ کر سنِ بلوغ کو پہنچا، تو فنکاروں کے نظریوں میں وسعت، ہمہ گیر وسعت کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ضیا کے نظریے میں بھی وسعت پیدا ہو گئی۔

منزلیں ہیں ابھی تو اور بہت ایک منزل کو پالیا بھی، تو کیا!
دل میں ہے درد کی کسک باقی تجھ کو اپنا بنالیا بھی، تو کیا!

نجی طور پر حسن کا قرب حاصل کر لینے کے باوجود ضرور نہیں کہ سماجی طور پر کسی بیدار شعور کو تسکینِ قلب بھی حاصل ہو جائے۔ وہ اس فضا پر، اس ماحول پر بلکہ زندگی کے ہر پہلو پر حسن کے نام سے نور کی بارش کا متمنّی ہوتا ہے۔ اس لیے اسے اپنی ذاتی کامیابی سے مسرّت حاصل نہیں ہوتی، اور وہ اپنی کامیابی کو فرضی غمِ واندوہ، وصل کے بعد ہجر و فرقت کے اندیشوں کے دھندلکوں میں گم کر دینے کی بجائے زندگی کے دوسرے غموں کے علاج کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔

ہزاروں سال سے انساں اسیرِ ہستی ہے ہیں آج کیوں نہ طلسمِ جہاں کو توڑ ہی دیں

اجل کو تابع فرماں مجھے بنانا ہے — سڑی گلی ہوئی لاشوں کو اب جھنجھوڑ ہی دوں

شاعر کا احساسِ لطافت پے در پے چرکوں سے گھائل ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور اس جذبۂ بغاوت سے ذہن میں سڑی گلی لاشوں (خستہ حال انسانوں) کو جھنجھوڑ کر اجل (زندگی کی مخالف طاقتوں کو تابعِ فرمان بنانے کا جذبہ جنم لیتا ہے۔

قطعات کے علاوہ ضیا کی غزلوں میں بھی جا بجا صحتمندانہ رجا کا جذبہ ملتا ہے:

حیاتِ تازہ کے نغموں سے گونجتی ہے فضا — نئی امنگ، نئی کروٹیں بدلتی ہے
سکوتِ یاس کے لب پر ہے نغمۂ امید — کرن سحر کی شبِ تار ہی میں پلتی ہے

ماحول کی ناسازگاری شاعر کے حساس دل میں یاسیت کی تلخی لہر، میٹھا میٹھا درد اور عجیب سی بےچینی پیدا کر دیتی ہے۔ ضیا کی غزلوں میں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں، جن میں یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان شعروں کی یاسیت ملاحظہ فرمائیے:

دن وہی ہیں اور راتیں بھی وہی — ہم دلِ مایوس کو سمجھا چکے کیا!

کہاں کا سفینہ، کہاں کا کنارا — نہ موجِ گرداب ہے گھر ہمارا

اور یہ کیفیت اور گہری ہو کر جنون میں تبدیل ہو جاتی اور دلِ مایوس کو آمادۂ عمل کرتی ہے۔ اسی ذہنی تبدیلی کا اثر شاعر کے کلام میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ مایوسی کی تمام تنہا دلذتوں کی جگہ اپنی بےچین روح کو مستقبل کی دنیا پاش تخیل سے جمکانے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ جہاں پہلے زندگی کا تصور مسلسل کرب، لامتناہی آہ و زاری اور ایک نہ ختم ہونے والی مصیبت کی شکل میں اس کے ذہن پر چھایا رہتا تھا، اب وہاں زندگی کی تلخیاں، زندگی کے تار و پود کو گھلا دینے والا زہر اس نفسیاتی تبدیلی کی لاگ سے ذہن کو اپنی بیخ کنی پر اکسانے لگتا ہے:

انقلاب کا آغاز ہے میرا انجام — خود بدل جائیگی یہ رسم کہن میرے بعد

اس شعر میں 'میرے بعد' کی ردیف شاعر کی پرانی ہمہ یاسیت کی طرف اشارہ ضرور کرتی ہے، لیکن شعر کا مجموعی تاثر غیر مبہم طور پر ثبت کرتا ہے کہ شاعر اب ناامیدی کے چنگل سے آزاد ہو چکا ہے۔ اس کا انقلابات پر ایمان لے آنا ہی اس قلب کی ماہیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ یہ شعر شاعر کا ایک اور ذہنی کیفیت کا بھی پتا دیتا ہے۔ یعنی وہ شخصی طور پر یاسیت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ رسوماتِ کہن اس کے بعد تبدیل ہوں گی۔ اس سے ایک دردِ پنہاں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اس رنج کا اظہار قدرتی امر ہے۔ شاعر بھی انسان ہے، فرشتہ نہیں، جو ہر قسم کے ذاتی محسوسات سے بے نیاز ہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا انجام (قربانی) انقلاباتِ زمانہ کا آغاز ہوگا، اور اس بات سے اس کے جذبۂ سماج دوستی کی تسکین ہوتی ہے۔ شخصی اور اجتماعی زندگی کے دو مختلف (متضاد نہیں) اثرات ایسے شعروں کی تخلیق کے محرک ہوا کرتے ہیں۔ سماج اور فرد کے باہمی رشتوں کو بخوبی سمجھنے والا ذہن ہی دونوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کر سکتا ہے، وہ کبھی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیگا۔

غزل جو کبھی محض حسن و عشق کی داستان بیان کرنے کے لیے مخصوص تھی، اب زندگی کی ساری الجھنوں، غموں، دکھوں اور حادثوں کے اظہار کا ذریعہ بنتی جا رہی ہے۔ ہاں غزل کا نازک مزاج اور اشاریت والا اسلوب اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اسے علمی یا منطقی دلیلوں سے بوجھل کیا جائے۔ جس نے کہا کہ غزل وحشی صنفِ شاعری ہے، اس نے غلط کہا۔ غزل ایک مہذب اور لطیف صنفِ شاعری ہے۔ لیکن تہذیب اور لطافت کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ مسائلِ حیات سے بے نیاز ہو جائے۔ غزل ہر موضوع کو برداشت کر سکتی ہے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ شاعر کو اسے ڈھنگ سے کہنے کا سلیقہ معلوم ہو۔ ضیا نے بھی اپنے ہم عصر شعرا کی طرح نئے انداز کی غزلیں کہی ہیں؛ اور وہ بہت خوبصورت غزلیں ہیں۔ وہ

غزل کے مزاج سے پوری طرح واقف ہیں۔ وہ اس کی لطافت کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ وہ اس کی روایت توڑنے کی بجائے اسے آگے لے جانے کے حق میں ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ فن کی روایتوں کو توڑ کر زندگی کی خدمت نہیں کی جاسکتی، بلکہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ان روایات کو حیاتِ نو کے تقاضوں کے مطابق آگے بڑھایا جائے۔

ہم نے چھیڑا ہے جب بھی سازِ جنوں نیرگیِ شب کی گنگنا دی ہے

جنون کی حسن پرور طبیعت اور اس کی قوتِ تخلیق کو اس سے بہتر الفاظ میں کوئی دوسری صنفِ شاعری پیش کرنے سے قاصر ہے۔ حقیقت اور رومان کا یہ حسین امتزاج غزل کو ہمیشہ زندہ رکھیگا۔

امیدیں جاں بلب، کچلی ہوئی دل کی تمنائیں
میں ہنستا ہوں کہ اک اندازِ ماتم یوں بھی ہوتا ہے

اس میں "یوں" سے پتھر کا دل بھی پسیج جائے۔ اسی رنگ میں شعر سنیے،

جبر کا سب طلسم ٹوٹ گیا جب ارادوں کی کائنات بنی

موجودہ سیاسی نظام میں شاعر کا مرتبہ کیا ہے؟ اس کا کچھ اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ شاعری اور بیکاری ہم معنی الفاظ ہو کر رہ گئے ہیں۔ شاعر کی اس زبوں حالی کو نہایت سلجھے ہوئے طنزیہ انداز میں یوں پیش کرتے ہیں:

جس کو ضیا دیکھو ہے شاعر بڑھتی جاتی ہے بیکاری

"نئی صبح" نامی نظم میں ان کا نظریۂ حیات واضح طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کر کے اسے مستقبل سے جوڑتے ہیں؛ اوہام پرستی پر بھرپور وار کرتے ہیں؛ یہاں تک کہ خدا پر بھی جس سے انھوں نے آج تک کبھی منھ نہیں موڑا تھا، ان کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔

خدا کا بھرم کھول دوں گا جہاں پر یقیں کانپ اٹھیگا میرے گماں پر

"شبِ تار" (نظامِ کہنہ) کے چلے جانے کا اور "نئی صبح" (جمہوریت) کے آنے کا انھیں پختہ یقین ہے :

نہیں دور، اب تو نظر آ رہی ہے اٹھو، دوستو! وہ سحر آ رہی ہے

آج کا شاعر اپنے آپ کو سماج کا ایک فرد سمجھنے لگا ہے۔ اسے اس بات کا پتا لگ چکا ہے کہ غموں کا مداوا اور زیادہ غموں میں نہیں، بلکہ اجتماعی جد و جہد میں ہے۔ آج تک زندگی کے مسائل کا حل، اس کی انفرادیت ڈھونڈنے سے قاصر رہی ہے۔ اجتماعیت نے اس کے ڈگمگاتے ہوئے پاؤں کو تقویت بخش دی ہے اور وہ زندگی کی کشمکش میں برابر کا شریک بن گیا ہے۔ ضیا کے ترقی یافتہ دماغ نے بھی غم کی پرستش چھوڑ کر مسرتوں کا دامن تھام لیا ہے :

سعی و عمل پہ رکھوں بنائے حیات کو
عشرت کا رازدار بنوں، غم کو چھوڑ دوں

اور جمہور کی قوتِ عمل پر ایمان مرادف ہے، ارضی اور سماوی دونوں سہاروں سے کنارہ کشی کے :

طوفاں کو اپنے عزم کے ہاتھوں سے دوں شکست
چھوڑا ہے ناخدا کو، خدا کو بھی چھوڑ دوں

"جاگ اے انسان"، مختصر لیکن بہت کامیاب نظم ہے۔ اس میں وہ جمہور کو بیدار ہونے کے لیے پکارتے اور ماضی کے از کار رفتہ نظام کو بدل دینے کی ترغیب دیتے ہیں :

نظمِ رنگ و بو بدل بادہ و سبو بدل
وقت کی پکار سن بے درنگ تو بدل
آفتاب آ گیا انقلاب آ گیا
اب ہے امتحان جاگ جاگ اے انسان جاگ

آج تک ہم جن عوام کو بےوقعت اور حقیر خیال کرتے آئے ہیں، ضیا ان کی

چھپی قوتوں کو فنکارانہ اصطلاحوں کے ذریعے پیش کرتے ہیں:

ذرّہ آفتاب ہے قطرہ موجِ آب ہے
راج ہے بہار کا خار بھی گلاب ہے
یہ ہنسی، یہ دلکشی دین تیرے ہوش کی

آخری شعر میں وہ حسن لطافت (یہ ہنسی، یہ دلکشی) کو کسی آسمانی یا غیبی طاقت کی دین سمجھنے کی بجائے انسان کے بڑھتے ہوئے شعور کی دین بتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ نظریہ اوہام پرستی کی بجائے کہیں زیادہ سائنٹفک ہے۔ خوش اعتقادی اور قدامت پرستی کے خلاف جس قدر اردو شاعروں نے لکھا ہے، شاید ہی کسی اور زبان میں اس کی مثال ملے۔ ضیا نے بھی اس روایت کو برقرار رکھا ہے:

منزل نہ رہی، رہبر نہ رہے، رہرو خود کو پہچان گئے
ان دھرموں کو، ایمانوں کو حالات کے ساتھ بدلنا ہے

اور جب دھرم اور ایمان حالات کے ساتھ بدلنا شروع کر دیں، تو وہ سائنس بن جاتے ہیں۔ کس لطیف طریقے سے اوہام پرستی پر چوٹ کی ہے!
فردا کے حسین خواب دیکھنے والا شاعر اگر حال سے بے پروا ہو کر صرف مستقبل ہی میں گم ہو جائے، تو فردا کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ مستقبل ہمیشہ حال کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ اس لیے حال کے سنوارنے کی سعی اتنی ہی لازمی ہے، جتنا مستقبل کے خوبصورت سپنوں سے دلوں میں ولولہ اور جوش بھرنے کی کوشش۔ فردا کے سپنوں کو مخاطب کرتے ہوئے ضیا صاحب کہتے ہیں، ابھی میں حال کی فکر میں مبتلا ہوں، اس لیے 'اے فردا کے سپنو! تم نہ آؤ۔ تم اس وقت آنا، جب:

ذرا وقت کروٹ بدل لے تو پھر میں تمہارے ہی رستے پہ گاتا چلوں گا
مٹا کر یہ صدیوں کی پُرہول ظلمت نکھرتے ہوئے نور میں بن سنور لوں

اور دیکھیے:

تمھارے لیے ڈوب کر زندگی میں　　غلط رفعتوں کو ڈبونا ہے مجھ کو
چلے جاؤ گے تم، تو بھڑکیں گے شعلے　　نئی قوتوں کے سہارے اٹھوں گا
تمھاری قسم ہے، تمھارے لیے میں　　زمانے کے دھارے کا رُخ موڑ دوں گا

ضیا کو منظر نگاری میں بھی کمال حاصل ہے۔ اس کی بہترین مثال ان کی نظم "تین دور" میں ملتی ہے:

وہ دُور سایے افق پر ابھرتے آتے ہیں　　کوئی حسینۂ کمسن ہے منہ چھپائے ہوئے
حسین ریشمی آنچل میں سرسراتے ہیں　　نقوش چہرۂ فردا کے تمتماتے ہوئے

۱۹۴۷ء کے فسادات نے ہر ادیب اور شاعر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اور ان میں سے بیشتر نے ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا۔ ضیا کی نظم "سویرا" ان معدودہ چند نظموں میں ہے، جو اپنی فنکارانہ قدروں کو پورا کرتے ہوئے شدتِ اثر کو بھی محفوظ رکھ سکتی ہے۔ ایسی کامیاب نظم لکھنے کے لیے صرف کہنہ مشقی ہی کافی نہیں ہوتی، بلکہ ادب کے گہرے مطالعے کی بھی ضرورت رہتی ہے۔

وہ مذہب آدمی کو آدمی سے جو لڑاتا ہے　　خدا کے نام پر جو شیطنت کو خود جگاتا ہے
وہ مذہب ابنِ آدم کا ہے رہبر! اے دلِ وحشی!
مجھے انسانیت کی موت پر آنسو بہانے ہیں　　یتیموں اور بیواؤں کے افسانے سنانے ہیں
جو گھر والے کبھی تھے، اب ہیں بے گھر! اے دلِ وحشی!

اسی مضمون کو انھوں نے "داتا" میں بھی لکھا ہے۔ زبان نہایت عام فہم، انداز بالکل سیدھا سادا اور بات ٹھوس۔ ان سب چیزوں سے یہ نظم عوام کے بہت قریب آ گئی ہے۔

اس مجموعے میں ان کی ایک اور بہت کامیاب نظم "فن کار" بھی شامل ہے، جس میں موجودہ نظامِ حیات سے ایک شاعر کی بیزاری اور اس کی مجبوریوں کو کٹیلے طنزیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور

جب تک فنکاریوں اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف لکھنے پر مجبور رہیگا ؛ جب تک اسے صرف محبت کے افسانے، گلوں کی خوبروئی کے قصیدے یا چاند کے حسن کی تعریف پر داد ملتی رہیگی ، اور اس کی اقتصادی حالت اس کے فن کی جڑوں کو کھوکھلا کرتی رہیگی ، ایسی نظمیں لکھنا بند نہیں ہونگی ۔ ضیا کی اس نظم کا انداز ، اس کی بندش اور اس کی تراکیب ——— ان سب نے مل کر اسے اس موضوع کی کامیاب نظموں میں جگہ دے دی ہے

روایاتِ ماضی ، حکایاتِ فردا — تبسم ، ترنم ، شکایت ، مداوا
خموشی ، تکلم ، ہنسی ، شور و غوغا — اجالا ، اندھیرا ، جوانی ، بڑھاپا
نظامِ حیات کہن بیچتا ہوں — خریدو مجھے جان و تن بیچتا ہوں
میں افسانے لکھتا ہوں ، کہتا ہوں غزلیں — زمانے میں مقبول ہیں میری نظمیں
ادب کو ہیں مجھ سے بہت کچھ امیدیں — نہیں پیٹ کی بھوک ہی میرے بس میں
بہ امیدِ یک نان ، فن بیچتا ہوں — خریدو مجھے ، جان و تن بیچتا ہوں

اور آخری بند میں یہ طنز اور بھی تیز ہو جاتی ہے :

مری آنکھ کی نم نمی کو نہ دیکھو — مرے عالم برہمی کو نہ دیکھو
مری زندگی کی کمی کو نہ دیکھو — مرے پیکرِ ماتمی کو نہ دیکھو
میں انسانیت کا کفن بیچتا ہوں — خریدو مجھے ، جان و تن بیچتا ہوں

یہ ایک مختصر نظم بھی ضیا کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے ۔

"گردِ راہ" میں رباعیات ، نظمیں اور غزلیں شامل ہیں ۔ ایک رباعی دیکھیے :

ہے صبح ، نہیں رات ، ذرا آنکھ اٹھا — اٹھتے ہیں حجابات ذرا آنکھ اٹھا
انسان کی خدائی کا زمانہ آیا — کیا بات ہے ، کیا بات ! ذرا آنکھ اٹھا

جہاں "کیا بات ہے کیا بات" رباعی کو فنی اعتبار سے ایک بلند مقام تک پہنچا دیتی ہے وہیں ضمناً ان کا نظریۂ حیات بھی اس سے جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔

ادب میں عصمت، اور ترقی پسند نظریے کے ادیب اور شعرا نے ہمیشہ ظلم کے خلاف آواز بلند کی ہے، چاہے وہ ظلم کسی ایک طبقے کے خلاف ہو، یا تمدنی اور تہذیبی ورثوں کے خلاف۔ اردو زبان کے ساتھ جو مخالفانہ رویّہ اختیار کیا گیا ہے، اسے دیکھتے ہوئے ہر حق پسند انسان لامحالہ احتجاج کریگا۔ اور پھر زبان کی حیثیت تو شاعر کی محبوبہ کی ہوتی ہے۔ ان کی اس سلسلے کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

اللہ رے، یہ شوکت و شانِ اردو ہندی پہ ہے مجھ کو گمانِ اردو
بیگانہ اسے لاکھ کہیں، اہلِ وطن ہاں 'اپنی ہے' اپنی ہے، زبانِ اردو

"اپنی ہے" کی تکرار نے اس رباعی کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

اس مجموعے میں ضیا صاحب کی بعض بہت خوبصورت نظمیں شامل ہیں۔ لیکن طوالت کے خوف سے صرف چند ایک کے اقتباسات پیش کرنے ہی پر اکتفا کرونگا:

جن سے انساں خطرے میں ہے، سہمی سہمی انسانیت
ان محلوں، ان ایوانوں کو میں آج گرانے آیا ہوں
جو رات کہ ننگِ عالم تھی، اس رات کا اب انجام آیا
سونے والو! جاگو، سنبھلو، بیداری کا ہنگام آیا

(صبح کا تارا)

مصائب کی رُوداد کہتے رہے ہو تھپیڑے حوادث کے سہتے رہے ہو
شب و روز طوفان میں بہتے رہے ہو بھنور کو بھی ساحل بناؤ، نوجوانو

(مطالبہ)

ہے بلندی زیرِ پا پستیوں کا ذکر کیا
کام کیا ہے یاس کا دل ہے ہمت آشنا

بے نیازی مل گئی
چارہ سازی مل گئی
سرفرازی مل گئی

فکرِ نائے و نوش ہے — یعنی اپنا ہوش ہے
باخبر ہشیار ہے — آدمی بیدار ہے

(انسانِ بیدار)

تقدیر تو کچھ نہیں، تدبیر ہے سب کچھ — آرام سے سجا گو، غمِ دوراں کو پکارو

(وقت کی پکار)

پی کر بھی ہوش ہے جنہیں آدابِ بزم کا — ساقی سے ایسے بادہ گساروں کو چھین لوں

(سینہ زوری)

حصۂ غزل میں بھی جا بجا ضیا کی انسان دوستی اور صحتمندانہ قوتوں کی ہم نوائی کے جواہر پارے نظر آتے ہیں:

دل کو کب تک قلقلِ مینا سے بہلائینگے ہم
خونِ دہقان، محنتِ مزدور کی باتیں کریں

مل ہی جائیگی منزل کہیں — جادہ پیما رہے کارواں

اس یاسیت زدہ دور میں ایسے اشعار کمیاب ہی نہیں، نایاب ہیں:

محبت، آرزو، آنسو، تبسّم، حوصلہ، کوشش
فرشتے کچھ نہ سمجھینگے، یہ مشتِ گِل کی باتیں ہیں
سحر کی منزلِ روشن میں جا پہنچے وہ دیوانے
شبِ تاریک میں جو نور کا لے کر عَلَم نکلے
ہمیں موڑنا ہے رُخِ موجِ طوفاں
سفینہ ڈبونے سے کیا فایدہ ہے!
وہی تیرگی ہے ابھی تک دلوں میں
ضیا صبح ہونے سے کیا فایدہ ہے!

ضیا سلجھے ہوئے، کہنہ مشق اور با سلیقہ شاعر ہیں۔ ان کی نظموں، غزلوں، قطعات اور رباعیات میں فن کے لوازمات کا پورا پورا التزام ملتا ہے۔ ان کا سینہ انسانیت کے درد سے لبریز ہے۔ ان کا دل اس کہنہ نظامِ زندگی، تقلید پرستی اور انسان کو مجبور و بے بس بنا دینے والی قوتوں کے خلاف جذبۂ بغاوت سے سرشار ہے۔ وہ صرف وہی بات کہتے ہیں، جس پر انھیں خود پورا یقین ہو۔ اسی لیے ان کے شعروں میں شدّت تاثر ہے۔ انھوں نے ترقی پسند اقدار کو صحیح طریقے سے پیش کیا ہے۔ وہ صرف فیشن کے طور پر ترقی پسند شعر نہیں کہتے، نہ وہ کسی خارجی اثر کے تحت لکھتے ہیں۔ جب زندگی کے جسم میں تلخیوں کا زہر سرایت کرتا ہے، تو ان کا حسّاس دل جھنجلا اٹھتا ہے، ان کا جذبۂ انصاف شعور کی گہرائی سے بیدار ہوتا ہے، اور دل اور دماغ کی ہم آہنگی ان کے شعروں میں جذبے اور منطق کو شیر و شکر کر کے پیش کر دیتی ہے۔ وہ جب تک خارجی اثرات کو اپنے دماغ میں پوری طرح سے رچا نہیں لیتے، جب تک ان کا منطقی دماغ جذباتی سطح پر نہیں آجاتا، وہ شعر نہیں کہتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شعر جذباتی اور نظریاتی کسوٹی دونوں پر پورے اترتے ہیں۔ وہ پرانی قدروں کو صرف جدّت کی خاطر توڑنے کے حق میں نہیں؛ وہ توڑنے سے زیادہ اسے آگے بڑھانے والے فنکاروں میں سے ہیں۔ انھیں فن کی نزاکت کا نہ صرف پورا پورا احساس ہے، بلکہ ان میں انھیں نبھانے کی اہلیت بھی ہے۔ وہ زندگی اور فن کے رشتے کی نزاکت کو سمجھتے ہیں اور سماج دشمن طاقتوں کو کچلنے والی نئی جمہوری قوت کی بے پناہ صلاحیت بھی ان سے مخفی نہیں۔

اعجاز صدیقی

ضیا فتح آبادی، بحیثیت نظم نگار

میرا ذہن ۱۹۳۰ اور ۱۹۴۰ء کے درمیانی زمانے کی طرف جارہا ہے، جب حالی، شبلی اور محمد حسین آزاد کی اصلاحی شاعری کے علاوہ ہمارے پاس نظمیہ شاعری کا کوئی قابلِ تقلید یا چونکا دینے والا سرمایہ نہ تھا۔ اگر کوئی بڑی "علامت" تھی تو وہ صرف نظیر اکبرآبادی کی ایک وسیع پس منظر میں پھیلی ہوئی نظم نگاری۔ اپنے دورِ اول میں اقبال کے فکری و فنی سانچوں نے اردو کی نظمیہ شاعری کو ایک انداز و وقار ضرور عطا کیا اور ان کے ساتھ ساتھ سیماب، چکبست، تلوک چند محروم، ظفر علی خان اور پھر جوش اور علی اختر وغیرہ نے بھی نظمیہ شاعری کو نیا آب و رنگ دیا۔ ان اصحاب کی مساعی سے ہیئتی تبدیلیاں زیادہ نہ سہی، لیکن اسلوبی اور موضوعی تازگی اردو نظم کو ضرور ملی۔

میں جس دور کا ذکر کر رہا ہوں، وہ پرانے سے نئے کی طرف آنے کا ایک عجیب دور تھا۔ زندہ دلانِ پنجاب نے ادب اور شاعری میں نئے نئے تجربے شروع کر دیے تھے۔ نئی کہانی، نئی نظم اور نئی تنقید اردو ادب کے افق سے جھانک رہی تھی۔ "مخزن" کے بعد "پیمانہ"، "شاہکار"، "ادبی دنیا"، "ہمایون"، "عالمگیر" اور "ساقی" جیسے ترقی یافتہ رسالے یکے بعد دیگرے نکلنا شروع ہو گئے۔ اس دور کی نئی نسل کی دلچسپی مغربی ادب سے بڑھ رہی تھی۔ کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ نئے ادبی رجحانات بروئے کار آرہے تھے۔ مغربی شاعری اور ہا بنوں کے

تراجم اردو فارسی کے سامنے آئے۔ پابند نظموں کی اُس بھیڑ میں، کچھ ایسے نوجوان شعرا ابھرے، جنھوں نے اپنے ذہنوں کو آزاد نظم (FREE VERSE) کی طرف مائل کیا اور علامت نگاری پر توجہ دی۔ یہ وہ دور تھا، جب ترقی پسندی یا جدیدیت کی آویزش نہ تھی، لیکن قدیم اور جدید، کلاسیکی اور غیر کلاسیکی کی بحثیں کبھی کبھی ضرور چھڑ جاتی تھیں۔ نئی شاعری کے ان تجربوں نے نہ صرف پڑھنے والوں کو، بلکہ اس دور کے اساتذۂ سخن کو بھی چونکا دیا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ پہلی با قاعدہ اجتماعی بحث ماہنامہ "نگار"، لکھنؤ کے "جدید شاعری نمبر" (سنہ یاد نہیں آرہا ہے) میں ہوئی تھی۔ مولانا نیاز فتحپوری اُن نئے تجربوں کے خلاف تھے اور جن اساتذۂ شعر و ادب نے اُس نمبر کے لیے مضامین لکھے تھے، ان میں سے بھی دو تین کے علاوہ، سبھی نے اُن تجربوں کو ناپسند کیا تھا۔ انھوں نے اس دور کی آزاد نظمیہ شاعری کو بے معنی، مبہم اور ذہن سے بیگانہ قرار دیا تھا، لیکن بعض نے ابہام، اشاریت اور علامتی انداز سے تھوڑا سا اختلاف کرتے ہوئے اسے سراہا بھی تھا اور قافیہ، ردیف، اور بحر کی پابندی سے اس "ابتدائی انحراف" کو خوش آیند قرار دیا تھا۔

اس دور کی نئی نسل کے شعرا میں مجھے جو نام یاد آرہے ہیں، وہ ن م راشد، تصدق حسین خالد، ڈاکٹر تاثیر (جو نئی نسل سے تعلق تو نہیں رکھتے تھے، مگر وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے نہ صرف نئی نسل کا دل بڑھایا، ان کے تجربوں کو سراہا، بلکہ خود بھی آزاد، مبہم اور معرّا نظمیہ شاعری کی) میراجی، مختار صدیقی، ضیا جالندھری، سیّد فیضی، یوسف ظفر، قیوم نظر اور مخمور جالندھری وغیرہ ہیں۔ ضیا فتح آبادی بھی اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اس دور کے عام رواج کے مطابق انھوں نے سیماب اکبر آبادی کو اصلاحِ سخن اور تربیتِ فن کے لیے منتخب کیا۔ اس لیے کہ اپنے دور کے ایک بڑے شاعر ہونے کے علاوہ سیماب نئے میلاناتِ شعری کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ نئے میلاناتِ شاعری رکھنے والے نوجوان شعرا کی بڑی تعداد

سیماب ہی کے دامنِ فیض سے وابستہ ہوئی اور ہمیشہ رہی۔ مختار صدیقی، ضیا جالندھری، سید فیضی، مخمور جالندھری، الطاف مشہدی، سراج الدین ظفر جیسے چند بڑے نام بطورِ مثال لیے جا سکتے ہیں۔ گویا اس دور کی نئی نظمیہ شاعری کے فروغ میں "آگرہ اسکول" کا فیض اور ایماء بھی شامل رہا ہے۔

ضیا فتح آبادی کا نام ۱۹۲۹ء ہی میں ابھرنے لگا تھا۔ ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۲ء، ۱۹۳۳ء، ۱۹۳۴ء کی چند نظمیں جو انھوں نے لاہور اور امرتسر میں کہی تھیں، اُن کے پہلے مجموعۂ کلام "نورِ مشرق" (۱۹۳۷ء) میں شامل ہیں۔ ۱۹۳۳ - ۱۹۳۵ء میں غالباً ضیا ایم اے کے طالب علم تھے۔ یہ ۴۲ سال پہلے کی بات ہے۔ "نورِ مشرق" کے آخری حصے میں ضیا فتح آبادی کے نو" سانیٹ"، جوانی، محبت، دل، اپنی میرا سے، یاد، دھوکا، اضطراب، جدائی اور دیوی کے عنوانات سے شامل ہیں۔ "سانیٹ" مغربی صنفِ نظم ہے۔ پنجاب کے زندہ دل نوجوانوں نے اس صنفِ سخن کو بھی اپنایا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ صنفِ سخن مقبول نہ ہو سکی۔ اس کی ہیئت ذرا سے اختلاف کے ساتھ پابند نظموں کی ہیئت ہی سے ملتی جلتی ہے۔ ضیا فتح آبادی کا ایک بہت پُرانا "سانیٹ" یہاں پیش کرتا ہوں۔

جوانی

بہار و شعر و موسیقی لیے دامانِ رنگیں میں
جوانی ہر نظر کو حُسن کا پیغام دیتی ہے
اُمید و آرزو اور شوق کے ایوانِ رنگیں میں
شرابِ بیخودی کے جام صبح و شام دیتی ہے
جوانی سرمدی نغمے کچھ اس ڈھب سے سناتی ہے
جنھیں سُن کر یقیں انساں کو آجاتا ہے ہستی پر
کہیں چشمے بہاتی ہے، کہیں غنچے کھلاتی ہے
کہیں مجبور کرتی ہے، چمن کو خود پرستی پر

دلِ آزاد میرا بے نیازِ رنگِ رہبر ہے
یہ جس رستے پہ لے جاتا ہے، اُس رستے پہ چلتا ہوں
نہ ڈر تنقیدِ عالم کا، نہ خوفِ قہرِ داور ہے
جوانی ڈھالتی ہے مجھ کو جس سانچے میں ڈھلتا ہوں
یہی دن ہیں جوانی کے، محبت کے، مسرت کے
ضعیفی کو مبارک حوصلے زہد و عبادت کے

(لاہور ۱۹۳۴ء)

یہ بات ۴۴ سال پہلے کے نئے شعری رجحانات کی کر رہا تھا، جو نظمِ آزاد کا دورِ آغاز تھا اور نئی تعلیم یافتہ نسل بہت سی قیودِ شعری کو توڑ کر استعارہ سازی، علامت نگاری اور ابہام کی طرف آ رہی تھی۔ ضیا فتح آبادی نے بھی اس وقت آزاد نظمیں کہیں۔ اُن کے مجموعۂ کلام "گردِ راہ" میں دریچے سے، نروان، جنگ کے بعد، پس منظر، خواب اور خواب، طوفان اور انگڑائی کے عنوانات سے سات اور تیسرے شعری مجموعے "نئی صبح" میں آخری بار، شیریں تلخی، فرار، تین آزاد نظمیں شامل ہیں۔

انگڑائی

گدگدی دل میں ہوئی
ولولے جاگ اُٹھے
آرزوؤں کے شگوفے پھوٹے
اُفقِ یاس سے پیدا ہوئی امید کی بیتاب کرن
شبستانِ تمنا میں ہر اک سمت اُجالا پھیلا
کھول دی، دیر سے سوئے ہوئے جذبات نے آنکھ
خرمنِ دل میں پھر اک آگ سی بھڑکی، چمکی
اک تڑپ، ایک شرار ــــــ
اس پہ ہے انجمنِ دہر کی گرمی کا مدار

خون رگ رگ میں رواں

اس سے حرکت میں ہے عالم کا نظام (۱۹۴۸)

نظم میں نرم اور شگفتہ الفاظ ہیں، کوئی ابہام اور رمزیت بھی نہیں ہے اور نہ وہ علامتی انداز جو اس دور میں ن۔م راشد، میراجی اور تصدق حسین خالد کے یہاں ابھرا تھا۔ نظم میں ایک واضح معنویت ہے۔ لیکن

خرمن دل میں پھر اک آگ سی بھڑکی، چمکی

اک تڑپ، ایک شرار

نظم کے یہ دونوں ٹکڑے یا مصرعے ایک تجریدی فضا اور آزاد اسلوب کا پتا ضرور دیتے ہیں۔ ہرچند یہ نظم ۲۹ سال پہلے کی ہے، لیکن اپنے اسلوب کے اعتبار سے اختر الایمان کی ایک بہت خوبصورت نظم "بازآمد" سے ملتی جلتی ہے:

تتلیاں ناچتی ہیں

پھول سے پھول پہ یوں جاتی ہیں

جیسے اک بات ہو جو

کان میں کہنی ہو خاموشی سے

اور ہر پھول ہنسا کرتا ہے سن کر یہ بات (اختر الایمان)

ضیا فتح آبادی کی ایک طویل نظم "فرار" جو غالباً نظم انگڑائی سے بھی پہلے کی ہے، ان کی آزاد نظموں میں زیادہ پہلودار، عصری حیثیت سے مملو اور جذبے سے بھرپور ہے۔ یہ نظم اس قابل ہے کہ اسے ۳۰ سال پہلے کی کہی ہوئی منتخب آزاد نظموں کے مجموعے میں شامل کیا جائے۔

جھنجھوڑ کر یہ کس نے خوابِ ناز سے جگا دیا

میں سو رہا تھا گہری نیندِ بےخبر مآل سے

نہ ابتدا کا عکس تھا، خیال کی نگاہ میں

میں پی رہا تھا پے بہ پے

انڈیل کر شرابِ حال وقت کے پیالے میں
ثباتِ مختصر مرے لیے پیامِ عیش تھی
شباب و حسن کی لذیذ چٹکیوں سے گدگدی تھی قلب میں
سجی سجائی اک عروسِ نو کی طرح دل نشیں
بہارِ غنچہ ہائے آرزو کو تھی نکھارتی
بھنور میں ولولوں کے پھنس گئی تھی کشتیِ جنوں!

نہ زمین مہیب گڑگڑا تا زلزلہ گیا
لرز اٹھی تمام کائنات، آنکھ کھل گئی
کھلی جو آنکھ تیرگی ہی تیرگی تھی ہر طرف
شباب و حسن اور بہار میں سے کوئی بھی نہ تھا
رباب و چنگ بھی نہ تھے ــــــ
دل و دماغ پر طلسمِ انقلاب چھا گیا
اتر گیا خمارِ بادۂ فسونِ انبساط ــــــ
نگاہ رفتہ رفتہ تیرگی سے آشنا ہوئی
نقوش ہلکے ہلکے آگئے ابھر کے سامنے
وہ صورتیں جنھیں میں جانتا تھا، جانتا نہ تھا
جو میرے ذہن و فکر کی حدود سے بھی دور تھیں
نقاب اٹھائے جلوہ گر تھیں اپنے اصلی روپ میں
نڈھال اور مضمحل ــــــ
کہیں رگوں میں خونِ گرم کا نشان تک نہ تھا
پچک گئے تھے گال اور لبوں پہ تھیں سیاہیاں
سیاہیوں سے ہمکنار زردیاں تھیں موت کی!
یہ تشنگی، یہ بھوک، جس کی انتہا کوئی نہیں،

یہ جاگتے ہوؤں کے خوفناک لرزہ خیز خواب
یہ چیختی ہوئی فضائیں روز و شب حیات کی
یہ بلبلاتی آرزوئیں قلب کے مزار پر
سکون کا خون، بیقراریوں کی مانگ کا سہاگ
یہ وحشیانہ کوششیں حصولِ مدعا سے تنگ
فریب و مکر کے بچھے ہوئے ہر ایک سمت جال
یقیں کے پاؤں اور بدگمانیوں کی بیڑیاں
ازل سے آدمی اسی طرح اسیرِ زیست ہے
تمام پردے، ایک ایک کرکے خود سرک گئے
حقیقتیں جو روشنی میں آنکھ سے چھپی رہیں
وہ ظلمتوں کا سینہ چاک کرکے جگمگا اٹھیں
کھلا جو رازِ کائنات، دل میں ایک درد اٹھا
فرار کی تلاش رینگنے لگی دماغ میں
میں سونا چاہتا ہوں پھر ـــــــ!

اپنی ہیئت اور مصرعوں کے در و بست کے اعتبار سے یہ جدید شاعر مجید امجد کی
دواں دواں نظم "آٹوگراف" سے ملتی جلتی ہے ـــ

کھلاڑیوں کے خود نوشت دستخط کے واسطے
کتابچے لیے ہوئے،
کھڑی ہیں منتظر حسین لڑکیاں
ڈھلکتے آنچلوں سے بےخبر حسین لڑکیاں (مجید امجد)

محولہ بالا نظم "فرار" اگر آج ضیا فتح آبادی کے نام کے بغیر شائع ہو جائے، تو یہ بالکل
اس دور کے کسی جدید شاعر کی فکر معلوم ہو۔

ہیئت کے اس تجرباتی دور میں آزاد نظموں کے علاوہ ضیا نے بہت سی پابند

نظمیں بھی کہیں اور غالباً ان کی شاعری کی ابتدا ہی نظم نگاری سے ہوئی۔ ان کے اوّلین مجموعۂ کلام "نورِ مشرق" (۱۹۳۷ء) میں ۴۳ نظمیں، ۷ گیت اور ۹ سانیٹ شامل ہیں: طلوعِ سحر، انقلاب بہار، دعوتِ سیر، ابرِ بہار، گھٹائیں، بسنت کا ترانہ، بوندوں کا سانہ، کرن، شاہکار فطرت، اے گل، صبح کا ستارا، گل نوشگفتہ۔ نظموں کے ان عنوانات، ان کے مواد اور لہجے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضیا کا رجحان "نیچرل شاعری" کی طرف رہا ہے۔ ان کی نظم "طلوعِ سحر" کا یہ آغاز دیکھیے:

ہوا طلوع افق پر ستارۂ سحری
ملی تمام جہاں کو نویدِ جلوہ گری
سفر کا حکم ملا کاروانِ انجم کو
سواریِ سحر آتی ہے، راہ صاف کرو

اور کئی مناظرِ فطرت کی عکاسی کے بعد شاعر کہتا ہے:

کسان بیل لیے دور جھونپڑے سے چلا
سحر کے نشّہ میں مخمور، جھونپڑے سے چلا
ہوئی بلند صدا مندروں سے گھنٹوں کی
اذاں موذّنِ مسجد نے دی، فضا جاگی

ایسا ہی نرم اور شگفتہ لہجہ اور فطرت سے دل دیدہ کا رشتہ، ضیا فتح آبادی کی دوسری نظموں میں بھی پایا جاتا ہے:

شعاعِ آفتاب، وہ افق پہ جلوہ گر ہوئی
تمام بزمِ کائنات جنّتِ نظر ہوئی
اٹھا یہ شور ہر طرف، سحر ہوئی، سحر ہوئی
لو آؤ سیر کو چلیں

پرندے بیخودی کے گیت گا رہے ہیں ہر طرف
فضائے دل میں یہ دل کو پھڑ پھڑا رہے ہیں ہر طرف

فسانہ صبحِ باغ کا سنا رہے ہیں ہر طرف
لو آؤ، سیر کو چلیں، (نظم دعوتِ سیر)

ضیا کی اس نوع کی نظموں سے ایک رچا ہوا ذوق آشکار ہے۔ ان کے یہاں شعری جمالیات کا بھی احساس ملتا ہے اور ان کا لہجہ رومانی معلوم ہوتا ہے۔ وہ دور اسی انداز کی نظمیہ شاعری کا تھا۔ اگر اختر شیرانی اور مجاز رومانی شاعری کر رہے تھے، تو پنجاب کے نوجوان شعرا فطری شاعری۔ آہستہ آہستہ ترقی پسندی کے دور میں اردو کی نیچرل شاعری کم ہوتی گئی اور اب تو نیچرل شاعری کی طرف شعرا آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے ہیں، حالانکہ نیچرل شاعری کا ایک بڑا درجہ ہے۔

ضیا فتح آبادی کے گیتوں میں ان کا لہجہ اور زیادہ خوبصورت اور دلنشیں ہو گیا ہے۔ اس نے "خالص ہندستانی آہنگ" کی صورت اختیار کر لی ہے۔ آس، کس اور، من کی بھول، برہن کا گیت، من کا گیت، نہ روک، پی بن۔ یہ گیت نہایت نرم و نازک اور آسان ہندی الفاظ میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں ہلکے ہلکے رومانی جذبے کی آنچ ہے۔ یہ مختصر سا گیت "کس اور" دیکھیے:

بدری روئے شور مچائے
بجلی کو بھی چین نہ آئے

ناچیں کیوں کر مور
پپیہے! پیا گئے کس اور

رات اندھیری کچھ نہ سوجھے
پی بن کوئی بات نہ بوجھے

جائے کہاں چکور
پپیہے! پیا گئے کس اور

پربت اونچا ہو کر دیکھے
اور ساگر پاتال میں ڈھونڈے

ندی مچائے شور

پپیہے! پیا گئے کس اُور

ضیا کے مجموعۂ کلام "گرد راہ" کی نظموں میں تیاگ، یاد کی یاد، دیپاولی، برہن، الجھن اور بیکار، کا نہ صرف لہجہ ہی خالص ہندستانی ہے، بلکہ ان نظموں کی فضا بھی ملکی ہے۔ تلمیحات، استعارات اور تلازمے تک دیسی ہیں۔ اپنے گیتوں کی طرح ان نظموں میں بھی انھوں نے نرم ہندستانی لفظیات سے کام لیا ہے۔

ضیا نے اپنی نظموں میں ہیئت کے کچھ تجربے اس دور میں کیے، جب حفیظ جالندھری، ساغر نظامی اور افسر میرٹھی وغیرہ نئی نئی ہیئتوں کے ساتھ نظمیں لکھ رہے تھے۔ ایسی نظموں میں "گرد راہ" کی نقش، انسانِ بیدار، فکر میں، یاد کی یاد، ممبر ا وطن، یوم آزادی اور "نور مشرق" کی نظمیں دعوتِ سیر، ابر بہار، بسنت کا ترانہ، کس طرح قرار ہو، مطربہ سے، تصور، آئینے کے سامنے، دعوتِ نظر، روح کا پیمانہ، انسان اور فرشتہ، اے مرے ہندستان ــــ اور تیسرے مجموعہ کلام "نئی صبح" کی نظمیں، جال، اے انسان، برسات، ہندستان آزاد ہوا، ابدی سفر، سویرا، بغاوت، دانا، آزاد زندگی، راہی، ادھشا، جواری اور ہنسی، ہیئتی تجربات کے ذیل میں رکھے جانے کے قابل ہیں۔ یہ سب نظمیں ۳۰-۳۵ سال پہلے کی ہیں۔ جدید نظم نگاری کے تشکیلی دور میں ضیا پیش پیش رہے ہیں اور اس کی توسیع میں ان کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہے۔ انھوں نے زبان و بیان کے کلاسیکی انداز و اسلوب سے انحراف نہیں کیا، نہ کھردرا پن پیدا ہونے دیا۔ ان کے یہاں ابہام و اشکال کبھی نہیں ـــــ آداب فن کو انھوں نے بہر حال محفوظ رکھا۔ ان کی نظمیں موجودہ دور کی جدت طرازیوں سے پاک ہیں (اور اس عہد میں جدت کا امکان تھا بھی نہیں) لیکن انھوں نے موضوعی تنوع کا خیال ہمیشہ رکھا ہے۔

ضیا کے تینوں مجموعوں میں بیانیہ انداز کی بھی کچھ نظمیں ہیں، لیکن ان میں بھی فکر و نظر کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ان میں کی بعض نظمیں اگر بہت گہری اور تہ دار نہیں

ہیں تو ایسی اُتھلی بھی نہیں، جنھیں ذوق قبول نہ کرے، یا جو آدابِ نظم سے عاری ہوں۔ ایک خوشگوار اور باشعور شاعر کی زائیدہ فکر یہ سب نظمیں ہیں۔ ہر شاعر کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے، ضیا کا اپنا مزاجِ شاعری ان کی نظموں میں رچا بسا ہے۔

ضیا کی نظمیہ شاعری کا یہ ایک سرسری جائزہ ہے۔ اس کے باوجود کہ ضیا نظم سے غزل کی طرف آ گئے تھے، میں سمجھتا ہوں کہ گذشتہ پندرہ بیس سال میں انھوں نے اور بھی نظمیں کہی ہونگی، مگر یہ نظمیں اس وقت میرے سامنے نہیں اور نہ ضیا کی بعد کی نظموں کا کوئی مجموعہ ہی شائع ہوا ہے۔ یہ جائزہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۶۰ء تک کی نظموں کا ہے۔ یقیناً اس دور کے بعد کی نظموں میں ان کے فکر و فن میں مزید نکھار اور ابھار پیدا ہوا ہوگا۔ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آزاد نظم سے آج بھی ان کی دلچسپی قائم ہے۔ رسالہ "بیسویں صدی" مئی ۱۹۷۷ء (کرشن چندر نمبر) میں "افسانے کی موت" کے عنوان سے ان کی ایک تازہ آزاد نظم نظر سے گذری ہے۔

ضیا فتح آبادی نہ حلقہ ارباب ذوق سے متعلق رہے، نہ ترقی پسندوں سے۔ اس کے باوجود ان کی نظمیہ شاعری قابلِ توجہ اور لائقِ انتخاب ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ضیا کی طرف سے ہمارے نقادوں نے غفلت برتی ہے اور خود ضیا نے بھی نظمیہ شاعری میں اپنے مقام کی تعیین کی کوشش نہیں کی۔ اردو شاعری کے پچھلے چالیس سالہ دور میں ضیا کا نام یقیناً قابلِ قدر و ذکر ہے۔

کوثر چاند پوری

ضیا فتح آبادی کی غزل سرائی

ضیا صاحب سنجیدہ، مخلص اور بہت شریف انسان ہیں۔ ان سب خصوصیات کو علم کی پشت پناہی حاصل ہے۔ ان کے پاس شخصیت ہے، مگر اس میں پیچیدگی نہیں، اس پر بہت زیادہ غلاف کبھی نہیں۔ صرف دو پرت ہیں؛ اوپری تہہ میں شاعرانہ حسن و جمال جھلکتا محسوس نہیں ہوتا۔ ایک طرح کی خشکی محیط نظر آتی ہے، اور وہ صرف حساب و کتاب کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اس پرت کو الٹ کر دیکھنے سے ان کی ذات میں شعر و ادب کی چنگاریاں سلگتی نظر آتی ہیں۔ ان میں دھواں نہیں، گرمی اور خفیف حدت ہے۔ بظاہر یہ دونوں باتیں متضاد ہیں؛ اتنی ہی فطری بھی ہیں۔ ان کے خاندان میں کسی شاعر نے کبھی جنم نہیں لیا۔ ان کی تعلیم و تربیت اسی خشک ماحول میں ہوئی جس کے صلے میں بینک کی بے کیف مصروفیتوں سے دو چار ہونا پڑا۔ مگر اندر ہی اندر فطرت اور اس کے رجحان کی پاکیزگی دل کی دھڑکنوں میں روشنی اور حرارت پیدا کر رہی تھی، جس کو شاعری کی آدرش ہی تسکین دے سکتی تھی۔ اسی کے نتیجے میں ضیا نے شعر و سخن کو اپنا فن بنا لیا۔ یہی ان کا اصل ذوق تھا، جس کو حسابی تعلیم کے مقابلے میں ذہنی کہنا چاہیے۔ وہ تمام اصنافِ سخن میں

طبع آزمائی کرتے ہیں۔ نظم، رباعی، گیت اور غزل، سب ہی کچھ کہتے ہیں۔ یہ ہمہ جہتی اکتسابی نہیں، قدرت کی دین ہے۔ نظموں میں جدید قدیم کا نہایت متوازن امتزاج ہے۔ رباعی کے متعلق سب ہی کو معلوم ہے کہ وہ نہایت نازک صنفِ سخن ہے۔ اسے چنبیلی کی کلی سمجھ لیجیے، جس کو ہر شخص چٹکیوں میں دبا کر سونگھ بھی نہیں سکتا۔ رباعی شارٹ ہینڈ میں لکھی ہوئی نظم ہے۔ اس کے لیے بڑی خلاقی مہارت اور باریک بینی کی ضرورت ہے۔ ضیا کو یہ سب چیزیں قدرت نے عطا کی ہیں۔ اسی لیے وہ رباعی خوب کہتے ہیں، اور اس کے فنی تقاضوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ چونکہ میں ان کی غزل پر اظہارِ خیال کر رہا ہوں، اس لیے رباعی کے نمونے پیش نہیں کروں گا۔

ضیا کی غزلوں میں کہیں کہیں گیتوں کا ساز سنائی دینے لگتا ہے۔ گیت کا مزاج غزل سے ملتا جلتا ہے۔ درد، اثر، جذبہ اور تخیل کا سہارا لیے بغیر گیت کی تخلیق نہیں کی جا سکتی۔ انھیں عناصر سے غزل کا خمیر بھی تیار ہوتا ہے۔ ضیا کے تخیل کی رو بہت آہستہ خرام ہے۔ اس میں بگولے کی سنسناہٹ اور زلزلے کی سی گڑگڑاہٹ نہیں، نہ کسی اور قسم کا شور و شغب ہے۔ وہی سنجیدگی، حلاوت، لہجے کی نرمی اور نزاکت ہر جگہ محیط ہے، جو اُن کی شخصیت کا حصہ ہے۔ سوقیانہ اور سطحی جذبات ضیا کے احساس کو چھو بھی نہیں گئے؛ ان کے ہاں کھوکھلی رومانیت سے کبھی گریز کی کوشش ملتی ہے؛ انسان دوستی اور انسانیت کی فلاح کا جذبہ اکثر اشعار میں مل جاتا ہے۔ ان کی محبت، انسان ہی کے گرد گھومتی ہے؛ ہجر و فراق اور حسن و عشق کے اظہار میں بڑا دھیما پن ہے۔ وہ محبت ہی کو رہنما سمجھتے ہیں، مگر اس محبت میں حرص و ہوس اور رقابت، رشک و حسد کی آنچ نہیں۔ ضیا اسی محبت کے سہارے تمام مراحلِ حیات سے گذر جانا چاہتے ہیں:

ہزاروں پیچ و خم ہر گام پہ تھے راہِ ہستی میں   محبت کو نہ میں رہبر بنا لیتا، تو کیا ہوتا!

ضیا کی محبت وہ نہیں، جو سوزِ فراق سے جنم لیتی ہے، بلکہ جیسا کہ ابھی کہا گیا، اس میں انسانیت کے فراق کے جذبات ہر جگہ مچلتے نظر آتے ہیں۔ ہجر و فراق کا بیان

ان کے یہاں ملتا ضرور ہے ؛ ایسا نہیں ہے کہ وہ حسن و عشق کی ارفع اور ابدی آویزشوں کے منکر ہوں۔ یہ تو وہ عناصر ہیں، جو شاعر کے فکر و خیال کو ندرتیں عطا کرتے ہیں، تخییل میں خوبصورتی اور توانائی پیدا کرتے ہیں۔ بات صرف انھیں عقل و شعور کے سانچے میں ڈھال لینے کی ہے۔ انھیں کھوکھلی روحانیت سے کوئی لگاؤ نہیں، بلکہ وہ محبت کی شمع سے جلن اور نور پیدا کرنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں، جس کے سہارے انسان بہ آسانی مشکلاتِ حیات کی پُرخار راہوں سے گذر جائے۔ وہ خود کہتے ہیں :

میری فکروں میں ہستی کار فرما مرے شعروں میں انسانوں کی دنیا

یہ دعویٰ بے دلیل نہیں۔ یقیناً ان کے اشعار میں ایک ایسی کائنات آباد ہے، جس میں اہمیت صرف انسان کو حاصل ہے۔

ضیا محبت کو ہر چیز پر ترجیح دیتے ہیں ؛ وہ اس کو کسی قیمت پر دینا نہیں چاہتے۔ اسی کے سوز و ساز پر ان کی زندگی کا مدار ہے :

مجھے محبت کا سوز دے دو، یہ ایٹموں کا جلال لے لو
حرارتِ خون کی آرزو ہے، شرار لے کر میں کیا کروںگا

حرارت اور شرارے میں جو تفاوت ہے، وہ اہلِ بصیرت سے مخفی نہیں۔ حرارت حرکت و عمل کا جذبہ بیدار کرتی ہے ؛ اور شرارے لباسِ زندگی کو خاکستر کر دیتے ہیں۔ شاعر جو انسانیت کا علمبردار، بلکہ پیغامبر ہے، وہ نرم اور معتدل گرمی ہی کا طالب ہے۔ اسی سے تعمیر کا حوصلہ ملتا ہے۔ اسے شعلوں کی خواہش نہیں ؛ ان سے آبشاروں اور مرغزاروں میں بھی آگ لگ جاتی ہے۔

ایک جگہ رات کی اندھیری کے مقابلے میں جو موت کی علامت ہے، صبح کی آمد کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

سمیٹو رات کے پُر ہول سایے سحر آہی گئی، اب سوچنا کیا !

وہ روشنی اور حرارت کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ انھیں پورا اعتماد ہے

کہ تاریکی دائمی نہیں، دوام صرف روشنی کو حاصل ہے :

زنداں کی دیواروں پر سورج کی کرنیں رقصاں ہیں
زنجیریں سوچا کرتی تھیں ۔ اس گھر میں چراغاں کیا ہوگا!

ضیا کو جہدِ حیات سے گہری دلچسپی ہے۔ اس مشغلہ کو وہ رزمگاہ زیست میں فتح و نصرت کا وسیلہ خیال کرتے ہیں :

کشتی کیوں ساحل پر ڈوبی!   موجیں ہوتیں، دریا ہوتا

ضیا حسن و عشق کی مختلف خصوصیات کا اظہار بہت احتیاط سے کرتے ہیں :

بن گئی ہیں دورِ ساغر بزمِ رنداں میں ضیا
ان کی شرمیلی نگاہوں کو نہ جانے کیا ہوا

غمِ جاناں میرے دل سے نہ گیا   کی غمِ دہر نے تحریک بہت
ضیا تو مریض غمِ عشق ہے   علاج اس کا اے چارہ گر! کچھ نہیں

ضیا محبت کو آدمی کی لازمی صفت خیال کرتے ہیں :

محبت ہے انسان کی آبرو   بغیرِ محبت بشر کچھ نہیں
ہم کو کرنی ہے مرتب داستانِ حسن و عشق   صبحِ دلی، شام نیشاپور کی باتیں کریں

ذکر جب ان کا آگیا، دل سے نکل گئی اک آہ
ہے تو خطا، مگر نہ تھی یہ مرے اختیار میں

ضیا ہر صورت میں پرچم انسانیت کو سربلند دیکھنا چاہتے ہیں ؛ اسی خواہش کو انسانیت کی حنابندی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے :

ختمِ عہدِ قیصر و فغفور کی باتیں کریں   دور یہ جمہوری ہے یہ، جمہور کی باتیں کریں
حوصلوں کو ہے ابھی قربانیوں کی احتیاج   دار کا چرچا کریں، منصور کی باتیں کریں
دل کو کب تک قلقلِ مینا سے بہلائینگے ہم!   خونِ دہقاں، محنتِ مزدور کی باتیں کریں

ضیا عداوت کے قائل نہیں ؛ وہ اسے دوستی کے دامن میں پناہ دینے کو تیار ہیں :   دشمنی کو ضیا! مل گئی   سایۂ دوستی میں اماں

ضیا کے کلام میں پختگی، حسنِ تخیل اور ندرتِ اسلوب کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ زبان صاف اور شستہ ہے۔ اس میں اہلِ زبان کی سی روانی ہے۔ یہ سب باتیں دلیل اور ثبوت ہیں، ان کی طویل مشقِ سخن کا اور یہ کہ انھوں نے کسی پختہ کار رہنما کے نقوشِ قدم کو اپنا مشعلِ راہ بنایا ہے۔ اب غزل کے چند ایسے اشعار دیکھیے، جن میں گیت کی لے، نیز ہندی شاعری کی علامات اور تشبیہات ملتی ہیں:

صبح نے روشن تیر چلائے
شب کا درپن ٹوٹا جائے

ماتھے پر بیندی کا سورج
آنکھوں میں کاجل کے سائے

بادل جھومے نیل گگن پر
گوری نے گیسو لہرائے

کیا پریتم آنے والا ہے
کاگا! تو کیوں شور مچائے

ضیا کی شعر گوئی کا ذوق جو ملازمت کی مصروفیتوں نے دبا رکھا تھا، نمایاں ہو کر رہا۔ اس نے ان کی ذاتی رفعت میں مزید بلندی پیدا کی۔ وہ شاعر نہ ہوتے تو ان کی زندگی اسی روز ختم ہو گئی ہوتی، جب وہ بینک کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ یہ شاعری کا طفیل ہے کہ ان کی حیاتِ مستعار کے ڈانڈے ابد کی حدود سے مل گئے ہیں۔

جاوید وششٹ

ضیاؔ فتح آبادی
کا
مذاقِ غزل

غزل اردو شاعری کی بڑی البیلی صنف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نے اسے "نیم وحشی صنفِ شاعری" قرار دیا تو کسی نے اسے "اردو شاعری کی آبرو"۔
اردو اصنافِ شاعری میں صنفِ غزل بڑی نرم و نازک، لطیف و نفیس، مہذب و تراشیدہ صنف ہے۔ آتش لکھنوی کا قول کہ

شاعری بھی کام ہے، آتش! مرصع ساز کا

پوری طرح سے اردو غزل پر صادق آتا ہے۔ لیکن غزل کی اس "مرصع سازی" نے جہاں غزل کی "خارجیت" کو نکھارا، وہیں غزل کی "داخلیت" کو مجروح بھی کیا۔
غزل کو سب سے آسان اور سب سے مشکل صنف بھی سمجھا جاتا رہا ہے۔ آسان اس لیے کہ مبتدی شاعر کی مشقِ سخن کے لیے یہ بہت ہی سہل صنف ہے۔ ہر مبتدی ردیف اور قافیہ سے شعر کا آغاز کر کے اس پر ایک مصرع لگا کر شعر کہہ سکتا ہے۔ اسی لیے بعض عروضیوں نے شعر کے دوسرے مصرع کو "مصرعِ اولیٰ" بھی کہا ہے۔ مبتدی شاعر غزل کہنے سے پہلے قوافی کی ایک طویل فہرست مرتب کرتا ہے، پھر قافیہ کے سہارے شعر کا نصاب پورا کرتا ہے۔ مگر حقیقی شاعری اس طرح نہیں کی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بڑا عروضی آج تک بڑا شاعر نہیں ہو سکا

البتہ مشقِ سخن کے بعد چند اچھے اشعار کا نکل آنا الگ بات ہے۔ ورنہ صحیح صورت یہی ہے کہ پہلے پہلا مصرع کہا جائے، بعد کو دوسرا اور وہ خود قافیہ کو بھی اپنے اندر لے لیگا۔ اس طرح محض قافیہ کی بنیاد پر شعر کھڑا نہیں ہوگا، بلکہ شاعر کا خیال خود قافیہ مانگ لیگا۔ لیکن یہ دوسرا طریقہ، ظاہر ہے آسان نہیں، بلکہ بہت مشکل ہے۔ غرض جہاں عروضی کا طریقہ "مصرعِ اولیٰ" غزل کو آسان مگر روایتی بنا دیتا ہے، وہیں عروضی کے "مصرعِ ثانی" کو پہلے کہنے کا طریقہ غزل کو دشوار تر کر دیتا ہے۔ غزل بڑی نازک مزاج صنف ہے۔ غزل کا آبگینہ ایک ایسا آبگینہ ہے کہ ذرا سی ٹھیس لگنے پر چکنا چور ہو جاتا ہے۔ غزل کو شاعر کے جذبات و احساسات کی "مقطرِ روح" بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے میرے نزدیک غزل کا فن سخت مشکل فن ہے۔ غزل کا ساز بڑا لطیف اور نغمہ لطیف تر ہے، غزل ع "سورج کو لیے چونچ میں مرغا کھڑا رہا" یا "گھوڑا بھڑک گیا، یکہ پلٹ گیا" قسم کے بھونڈے انداز کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کی جدید کوششیں مضحکہ خیز جدت طرازی ہی کہی جا سکتی ہیں۔ یہ غزل کے شیش محل پر سنگ باری ہے۔ اس قسم کی جارحیت روحِ غزل کو مجروح کرتی ہے۔

غزل میں بے پناہ لچک بھی ہے۔ غزل جب صوفیوں کی خانقاہ میں پہنچی، تو اس نے "دنیا ہیچ و کارِ دنیا ہمہ ہیچ" کا نعرہ لگایا اور "ہمہ اوست" اور "ہمہ از اوست" کے قالب میں ڈھل گئی۔ جب شاہی درباروں اور راج محلوں میں داخل ہوئی تو "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کا راگ الاپا؛ اور شاہد و شراب، خندہ و قہقہہ سے عبارت ہو گئی۔ "ریختی" کا روپ دھار لیا تو شہوانی جذبات کو ابھارنے کا آلہ کار بن گئی۔ کتنا بڑا انقلاب ہے! میدانِ جنگ میں پہنچی، تو رجز خوانی کرنے لگی۔ انقلاب کا نعرہ لگایا، اور سرفروشی کی تمنا کا کھلا ڈلا اظہار کیا۔ جب لکھنوی شعرا نے اردو غزل کو "چوما چاٹی" اور "چوٹی کنگھی" کی شاعری بنا دیا، تو سب سے پہلے الطاف حسین حالی نے غزل کی اصلاح

کا بیڑا اٹھایا اور "مقدمۂ شعر و شاعری" لکھا۔ ترقی پسند تحریک نے تو اپنے منشور میں غزل کو گردن زدنی ہی قرار دے دیا۔ جگر مراد آبادی ایسا خالص غزل گو شاعر بھی کہہ اٹھا:

شاعر نہیں ہے وہ، جو غزل خواں ہے آج کل

وقتی طور پر ایسا محسوس ہونے لگا کہ شاید اب غزل مر جائیگی۔ مگر غزل ٹھہری سدا بہار اور سدا سہاگن صنف، اس نے فلم اور ریڈیو سے اپنا جادو جگایا۔ یہاں تک کہ پنجابی اور ہندی کوی بھی غزل کہنے لگے۔ ہر مشاعرے کے بعد یہ جملہ عام طور پر سنا جاتا کہ "محفل میں مزا آ گیا۔"

غرض غزل اب "گفتگو با زنان" تک محدود نہیں ہے۔ اس وسیع کائنات کا ہر موضوع اب غزل کی گرفت میں ہے۔ زندگی کا ہر پہلو، ہر رنگ غزل میں جھلکتا ہے۔ "تنگنائے غزل" اصل میں ردیف و قافیہ کی پابندی ہے۔ ردیف غزل کی غنائیت کو قائم رکھتی ہے اور غیر مردّف غزل فکری عناصر کے لیے مخصوص ہے۔ غزل میں بڑی وسعت ہے۔ البتہ جدّت طرازی اور تنوّع پسندی کا تقاضا ہے کہ دیگر اصنافِ شاعری پر بھی توجہ دی جائے۔

غزل کا فن بڑی ریاضت چاہتا ہے۔ بیشک "آمد" غزل کے شعر کو عالمِ وجود میں لاتی ہے، مگر "آورد" کی خراد پر چڑھا کر ہی اس کی تراش خراش کی جاتی ہے:

سو بار جب عقیق کٹا، تب نگیں ہوا

جذبہ و احساس کی "مفطر روح" کا دوسرا نام غزل ہے۔ لیکن جس لمحے شعر کی تخلیق ہوتی ہے، وہ ہرگز اس لمحے کی پیداوار نہیں ہوتا۔ وہ لمحہ تو صرف اسے خلوت سے جلوت میں لاتا ہے۔ شعر کا ابتدائی روپ جذبہ و احساس کی شدّت ہے۔ مدتوں یہ شدّت، ذہن کی گمنام تہوں کے پیچ و خم سے گزرتی ہے، شعور و لاشعور کی انجان وادیوں میں بھٹکتی ہے، زندگی کی آنچ میں تپتی ہے۔ اور اتنے ہفتخواں طے کرنے کے بعد کہیں وہ شعر کی شکل اختیار کرتی ہے۔

اور تو اور، فی البدیہہ شعر بھی اس لمحے کی دین نہیں ہوتا، اس کے پیچھے بھی طویل تجرباتِ و مشاہدات کی ایک وسیع دنیا ہوتی ہے۔ لمحۂ تخلیق تو صرف عروسِ سخن کی نقاب کشائی کرتا ہے، ورنہ ع بیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں۔

اس تمہید کے بعد، اب آئیے! ہم ضیا فتح آبادی تلمیذ سیماب اکبر آبادی مرحوم کے مذاقِ غزل کا جائزہ لیں۔

ضیا فتح آبادی ایک کہنہ مشق غزل گو شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں پر سرسری نظر ڈالنے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ روایتی غزل گوئی سے اپنا دامن نہیں بچا سکے۔ ان کی بیشتر غزلوں پر روایتی کہنگی و مشاقی کا سایہ ہے۔ یہی غزل کی کٹھن منزل ہے۔ غزل میں طرفگی و تازگی پیدا کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ بیشتر مقامات پر ضیا صاحب اس اوگھٹ گھاٹی میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔ تاہم ایک عمر کی مشق و مہارت آڑے آتی ہے۔ وہ "مذاقِ غزل" کی تکمیل کے لیے ایک "جرعۂ غم" کی تمنا کرتے ہیں:

مذاقِ غزل نامکمل ہے اس کا
ضیا کو بھی اک جرعۂ غم خدا را!

ان کے چند مقطعے اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ ضیا صاحب ابھی "یقینِ محکم" کی منزل سے دور ہیں۔ دوسرے لفظوں میں "خود اعتمادی" پر ان کی گرفت ڈھیلی ہے۔

بعض مقطعوں میں "تعلّی" اور بعض میں اس کے برعکس "احساسِ کمتری" ایک نفسیاتی الجھن کی نشاندہی کرتی ہے مثلاً تعلّی دیکھیے:

سیکھ لی بلبلوں نے نغمہ گری اے ضیا! میری خوش بیانی سے

اس تعلّی میں غالب کے اس شعر کی آوازِ بازگشت صاف سنائی دیتی ہے:

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

ایک اور مقطع ہے :

اشعارِ ضیا تم تو سُن لو، کہتے ہیں جو اُن کو کہنے دو !
اس شعر و سخن کی محفل میں ۰ اب کوئی غزلخواں کیا ہوگا

("کہتے ہیں جو ان کو کہنے دو !" میں ان حریفوں کی طرف اشارہ ہے جو اشعارِ ضیا کو سننا بھی پسند نہیں کرتے۔)

یا یہ مقطع :

ابھرنے دو ادب کو، اے ضیا ! ظلماتِ پستی سے
ستارہ بن کے چمکیگا یہی روشن کلام اپنا

(یہاں بھی "ظلماتِ پستی" کا احساس دامن گیر ہے۔)

ایک اور مقطع ملاحظہ کیجیے :

سکونِ ذہن و خاطر کا بھی تو نے کھو دیا
ضیا ! کیا ملا تجھ کو مشہور رہو کر

اب ذرا ان کا یہ اعتراف بھی دیکھیے :

جس پر محفل لٹ جاتی ہے
تجھ کو ضیا ! وہ بات نہ آئی

اے مغنیؔ ! غزل ضیا کی نہ چھیڑ
شاعری کا بھرم نہ کھل جائے

جانتا ہوں، مری نظموں کی، مری غزلوں کی
قدر پہچانینگے یارانِ سخن، میرے بعد

ناز تو ہے مجھے ضیا ! اپنے کلام پر مگر
اہلِ سخن کی بزم میں میرا کوئی مقام ہے ؟

غرض مشاعرہ لوٹنے کی تمنّا، شاعری کے بھرم کھل جانے کی بات، احساسِ ناقدر شناسی اور یہ سوال کہ ؎ اہلِ سخن کی بزم میں میرا کوئی مقام ہے ؟ مجموعی

طور پر اس نفسیاتی کشمکش میں خود اعتمادی کی کمی اور پسپائی جھلکتی ہے۔
لیکن اس کے باوجود ضیا ہمت نہیں ہارے ، بلکہ "شاعرِ رنگ و نور" ہونے کا
اعلان کرتے ہیں۔ مثلاً

شاعرِ رنگ و نور ہوں، حسن سے مجھ کو کام ہے
پھول ہیں مجھ سے ہم سخن، چاند بھی ہمکلام ہے

اور پھر تو نزولِ شعر ہونے لگتا ہے:

اے ضیا! شعر کا اس طور سے ہوتا ہے نزول
عرش سے جیسے کوئی حور اُتر آتی ہے

تاروں کی چمک، کلیوں کی چٹک، موجوں کا ترنم، حسن حوال
ہم تجھ کو ضیا! اس عالم میں مدہوش و غزلخواں دیکھیں گے

اور اس طرح ضیا "حسنِ اندازِ بیاں" پر اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیتے
ہیں۔ وہ "متاعِ فکر" کے زیادہ قائل نہیں۔ فرماتے ہیں:

اے ضیا! تیری متاعِ فکر کا قائل نہیں
حسنِ اندازِ بیاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

ضیا کی غزل میں اندازِ بیاں کا حسن ہندی عناصر میں خوب نکھرتا ہے۔ ان کے
یہ چند شعر دیکھیے:-

اُن کو بنایا من اُدھیکاری — میں نے جیتی بازی ہاری
پریم کی بازی میں نے اکثر — ہار کے جیتی، جیت کے ہاری
کلجگ آیا، کلجگ آیا — رام دُہائی ، رام دُہائی
گھونگٹ سے یوں آنسو نے جھانکا — کوئی کلی جیسے مسکائی

ماتھے پر بندی کا سورج — آنکھوں میں کاجل کے سائے
بادل جھومے نیل گگن پر — گوری نے گیسو لہرائے
ہر ذرّے میں سورج روشن — دھرتی سے آکاش لجائے

کس نے چھیڑا گیت ضیا کا ؟
پیار کا ساگر امنڈ آئے

پربت کا سندیسا لے کر گھر آئے ہیں بادل کالے
باہیں جیسے پھول کی شاخیں آنکھیں جیسے مد کے پیالے

اور اس قسم کے اشعار میں بلاشبہ ضیا صاحب نے "شاعرِ رنگ و نور" ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

شاعرِ رنگ و نور تاریکیِ حالات سے مایوس نہیں ہوتا، بلکہ اُسے ہر لمحہ امیدِ سحر ہوتی ہے:

سکوتِ یاس کے لب پر ہے نغمۂ امید
کرن سحر کی شبِ تار ہی میں پلتی ہے

اسی لیے ضیا اپنی غزلوں میں رجائیت پسند یا آشاوادی ہی نظر آتے ہیں:

پریشانیاں حاصلِ زندگی ہیں پریشان ہونے سے کیا فائدہ ہے
اجالوں کو ڈھونڈو، سحر کو پکارو اندھیروں میں رونے سے کیا فائدہ ہے
ضیا نور ہی نور ہے اب دہاں تک نظر آرہے تھے جہاں کل دھندلکے

رجائی اندازِ نظر ہی سے رموزِ حیات و کائنات کھلتے ہیں، مشاہدے میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ ضیا کی غزلوں میں ایسے اشعار جا بجا بکھرے ہوئے ملیں گے، جن میں حقائق کو بےنقاب کیا گیا ہے۔ مثلاً بشر شر سے عبارت ہے ۹

کوششِ امن تو بجا ہے مگر آدمی فطرتاً فسادی ہے

یہ دنیا ایک تماشا ہے، فریبِ نظر ہے، صرف محبّت کے سہارے ہی انسان جی سکتا ہے:

تماشا ہے سب کچھ، مگر کچھ نہیں سوائے فریبِ نظر کچھ نہیں
محبّت ہے انسان کی آبرو بغیرِ محبّت بشر کچھ نہیں

غم اک دولتِ بیدار ہے:

غم کی دولت پا کر خوش ہیں عشق و محبت کے سودائی

وقت بڑا معالج ہے:

وقت نے خود کی مسیحائی ضیاؔ! ورنہ بھر سکتا تھا زخمِ دل کہاں!

فطرتِ اہلِ زمانہ اک معمہ ہے:

فطرتِ اہلِ زمانہ بھی معمّا ہے، ضیاؔ!
چھوٹی سی بات کو افسانہ بنا دیتے ہیں

کم فرصتی:

بیت جائیں گے محبت کے یہ لمحاتِ حسیں
یاد ان لمحوں کی تا زیست مگر آئیگی

ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آدمی تو ہے آج بھی زندہ جیتے انسان مر گیا کب کا!
آنکھ ملتے ہی لگ گئی چپ سی لب پہ آیا نہ حرفِ مطلب کا
ہے مرا نجر بہ مگر کچھ اور لوگ کہتے ہیں، ہے خدا سب کا

عمر بھر کا لگا لیا ہے روگ
میہماں کر کے غم کو اک شب کا

ضیا صاحب کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ

روایتی پیکرِ غزل میں بھرا ہے رنگِ جدید میں نے

ختم عہدِ قیصر و فغفور کی باتیں کریں
دورِ جمہوری ہے یہ، جمہور کی باتیں کریں
حوصلوں کو ہے ابھی قربانیوں کی احتیاج
دار کا چرچا کریں، منصور کی باتیں کریں

دل کو کب تک قلقلِ مینا سے بہلائیں گے ہم!
خونِ دہقاں، محنتِ مزدور کی باتیں کریں

ضیا صاحب کی نئی غزلوں میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں مثلاً

یوں حسرتوں کی گرد میں تھا دل اٹا ہوا
جیسے درخت سے کوئی پتا گرا ہوا

ملتا سراغ خاک مجھے اپنے سایے کا
ہر سمت ظلمتوں کا تھا جنگل اُگا ہوا

باہر کے شور و غل ہی سے شاید وہ بول اٹھے
بیٹھا ہے کب سے چپ کوئی اندر چھپا ہوا

پہچانے کون خود کو کہ آئینہ خانے میں
ہر چہرے پر ہے دوسرا چہرہ لگا ہوا

ضیا صاحب کی نئی غزلیں اس بات کی صاف غمازی کرتی ہیں کہ ان کا فن سے ارتقا پذیر رہا ہے، وہ کلاسیکیت سے جدیدیت کی طرف گامزن ہے۔ اور یہ ایک صحتمند علامت ہے۔ گویا ضیا صاحب روایتی پیکرِ غزل کے گرداب سے نکل آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں جمود کی کیفیت نہیں پیدا ہوئی۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ غزل کے روایتی انداز ہی میں الجھ کر رہ جاتے۔ ہمیں ان کی نئی غزلوں سے توقع ہے کہ وہ اُردو غزل کو ایک نیا رُخ دینگے، نئی حرکت و حرارت کے ساتھ زندگی اور سماج کے حقائق و رموز کا انکشاف کرینگے۔ اور وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہونگے۔

اے زمیں! ہم نے تیرے قدموں پر
آسماں کی جبیں جھکا دی ہے

سنبه نند رجا ؤارشک

کلامِ ضیا : ضیاؔ کے کلام

شعر الہام ہے۔ سینۂ فطرت کے پوشیدہ راز سب سے پہلے شاعر کے ذہن و قلب پر وارد ہوتے ہیں اور وہ انھیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتا ہے۔ یا وہ نغمے بن کر اس کی زبان سے پھوٹ پڑتے ہیں۔ اس حیثیت سے خدا اور رسول کے بعد پہلا درجہ شاعر کا ہے۔ الہام اسے فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے، اور نظرِ غائرِ ارض و سماء کے مطالعے سے۔ شاعری قانونِ وراثت کی پابند نہیں کیونکہ شعر بحیثیتِ الہام خدائی دین ہے ضیا فتح آبادی کو شاعری ورثے میں نہیں ملی۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے تخیّل اور احساسِ دل کی تخلیق کی ذمہ دار اس کی والدہ ہیں۔ لیکن اس تخیّل اور احساس کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کا ملکہ تو خداداد ہے۔ مجموعی طور پر ضیا کے کلام میں وہ سب کچھ ہے، جو ایک حقیقی شاعر کے کلام میں ہونا چاہیے۔ جب وہ اس طرح کے اشعار کہتا ہے:

خمار آلودہ آنکھوں میں تمھاری
سمٹ آئی ہے ہے کوثر کی جوانی

جب جہاں محوِ خواب ہوتا ہے | بیچ کر عقل و ہوش سوتا ہے۔
موت دنیا پہ دیکھ کر طاری | میں کبھی روتا ہوں، دل بھی روتا ہے۔

کمالِ ضبط میں آنسو نکل آتے ہیں آنکھوں سے
نظامِ کائناتِ عشق برہم یوں بھی ہوتا ہے

میری آنکھیں لگی ہیں تاروں سے
یہ کبھی میری طرح ہیں سوز بجاں
میری ناکامیاں کوئی دیکھے
زندگی سے بھی خوف آتا ہے

تو اس کے کلام میں میر و فانی کے سوز و جذب، سادگی و حسنِ تغزل کا احساس ہوتا ہے اور پھر جب اس کی نظم کی طرف توجہ دیں، تو اس کے کلام میں جو فطرت کی گلکاری اور مناظرِ قدرت کی نقاشی ہے، وہ آپ کو اقبال کے کلام کے دورِ اوّل سے ہمکنار کر دیگی "عورت کی تخلیق"، "بوندوں کا ساز"، "طلوعِ سحر"، "دعوتِ سیر"، اور کئی اور نظموں میں وہی رنگ جھلک رہا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

نشاط افروز شامِ رنگیں لطافتوں کو بڑھا رہی ہے
لیے ہوئے ساز بدلیوں کا شباب کے گیت گا رہی ہے
اگرچہ خورشید چھپ گیا ہے، مگر ابھی تک شعاعِ آخر
کہیں کہیں بادلوں میں منظر حسین و دلکش بنا رہی ہے
دلوں میں وحشت، سروں میں سودا، نگاہ مضطر، حواس گم ہیں
گرج گرج کر سیاہ بدلی ہزار فتنے جگا رہی ہے

(بوندوں کا ساز)

چٹک چٹک کے ہر کلی پیام دے رہی ہے یہ
ہوا کی رَوِ رُخ پر دری پیام دے رہی ہے یہ
سحر میں چھپ کے زندگی پیام دے رہی ہے یہ
لو آؤ سیر کو چلیں

(دعوتِ سیر)

اقبال کا مفکرانہ انداز بھی آپ کو ضیا کی نظموں میں ملیگا۔ "حیات و موت"،

ہیں کہتا ہے:

طوفان ہوا سخت آندھی سرگرم سفر ہیں ماہ و خورشید
موجوں کو نہیں ہے فکرِ راحت ہر دم ہے روانیوں کی تجدید
فطرت کو قیام سے نہیں کام کرتا ہے زمانہ اس کی تائید
ہستی ہے سفر کا دوسرا نام منزل کا نظارہ، موت کی دید

وہی تیور ہیں، وہی دعوتِ عمل ہے، جو اقبال کی نظموں میں ملتی ہے۔ اور پھر ضیا کی پُرجرأت نظم "اگر خدا ہے" کے وہی "شکوۂ اقبال" والے انداز ہیں، وہی زورِ بیان ہے، وہی روانی ہے، وہی پُرخلوص شاعر کا شکوہ، وہی بغاوت کا لہجہ۔ ملاحظہ فرمائیے:

اگر خدا ہے، تو پھر زمانے میں رنج و اندوہ و درد کیوں ہے!
زبانِ بلبل پہ نالہ کیا ہے؟ یہ رُوئے گل زرد زرد کیوں ہے!
اگر خدا ہے، تو کیوں نہیں ہے بہارِ عالم کی جاودانی
ہر ایک شے بے ثبات اس کی، ہر ایک شے اس کی آنی جانی

اور وہی احساسِ حقیقت جو اقبال کو میسّر ہوا، ضیا کو بھی ہوتا ہے، اور اُسی زوردار انداز میں نویدِ صبح دیتا ہے۔

وہ دیکھ مشرق سے نور ابھرا، لیے ہوئے جلوۂ حقیقت
مجاز کی ترک کر غلامی کہ تو تو ہے بندۂ حقیقت

غرض ضیا ہم کو میر اور فانی کے سوز و جذب کے ساتھ ساتھ ایک مفکر کی طرح حقیقت سے روشناس کراتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ سوز و ساز، فکرِ عالی، اور مناظرِ قدرت کے علاوہ ضیا کے کلام میں کہیں کہیں شراب کے رنگین چھینٹے بھی ہیں۔ خیّام کے خمریات سے بھی اس کا جام خالی نہیں۔ جوش ملیح آبادی نے اس کی سادگی اور سلامت روی کو اس کی راہ کا پیغمبر قرار دیا، اور یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ اپنے شباب

اور موسم کے ساتھ خلوص نہیں رکھتا۔ لیکن اس سادگی اور سلامت روی کے باوجود ضیا کے پُرخلوص علم نے شباب اور موسم کے عین مطابق شعر کہے ہیں، جو اس کی عروسِ شاعری کو زیورِ حُسن سے آراستہ کر گئے ہیں اور کسی حد تک جوشؔ کے گِلے کی تلافی بھی ضیا نے کر دی ہے۔ اس میں لَے بھی ہے اور موسیقی بھی، لیکن انداز نرالا ہے:

ساغر بھرے ہیں کوثر بھرے ہیں
میکش اٹھا لیں پی لیں، پلا لیں
ہے عام رحمت ہنگامِ عشرت
خالی نہ جائیں کافر گھٹائیں (گھٹائیں ے)

آؤ، ہم پھر پییں، پلائیں کہیں موسمِ نو کا لطف اٹھائیں کہیں
آؤ پھر چھیڑ دیں شباب کا ساز ہونے والا ہے سالِ نو آغاز

(سالِ نو)

جب مرا ساقی مجھے بھر بھر کے دیگا جامِ مے
بھول جاؤنگا کہ دنیا میں کوئی شئے غم بھی ہے

کام شام و سحر ہے مستی سے میں ہوں آزاد رنجِ ہستی سے
کیوں میں اے فکرِ باطلِ فردا! باز آجاؤں مے پرستی سے

لیجئے جوشؔ کی شکایت کا ازالہ دو شعر کر گئے ہیں:

دور میں جامِ ارغوانی ہے صحبتِ عیشِ جاودانی ہے
کیا ڈراتا ہے مجھ کو، اے واعظ! میں جواں ہوں، مری جوانی ہے

ضیا صرف کامیاب غزل اور نظم ہی نہیں لکھتا، وہ گیت کی لَے پر بھی بار ہا گنگنایا ہے۔ گیتوں والا ضیا ہمیں غزل گو اور نظم سرا ضیا سے مختلف دکھائی دیتا ہے۔ اس کے گیتوں میں کسی الھڑ دوشیزہ کی سی سادگی ہے، کوئی تصنع نہیں، کوئی بناوٹ نہیں۔ پھر بھی ان میں بے پناہ کشش ہے۔ انسان اس کی

اصطلاحوں سے ماورا گیتوں کی موسیقی میں ڈوب جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے سطحِ آب پر رات کے وقت ایک بجرا بڑی آہستگی کے ساتھ تیر رہا ہے، اس میں ایک جوگن ستار لیے مدھم سروں میں کوئی دلکش نغمہ الاپ رہی ہے، اور یہ نور و موسیقی کا کارواں سنسار بھر کو گیت کے ساگر میں ڈبو رہا ہے۔ یہی عالم ٹیگور کے گیت سن کر ہوتا ہے۔ سنیے:

بیاں ساگر گھٹا ٹھٹیں ارے — گھور اندھیرا دور کنارے
من کی نیا پریم سہارے — ڈالن کی آس سکھی رے پیا ملن کی آس

اور ایک اور گیت کے بول ہیں:

رات اندھیری کچھ نہ سوجھے — پی بن کوئی بات نا بوجھے
جائے کہاں چکور — پپیہے! پیا گئے کس اور!

برہن گیت میں لکھتے ہیں:

نیلا امبر، کالا بادل — جیسے ہو نینوں میں کاجل
من مورا ہے پریم کی کونپل — کھلتے ہی مرجھائے سکھی رے بیتم ناہیں آئے

ہندی کے اس دورے میں ضیا کے گیتوں کی عام فہم، میٹھی زبان کسی جوانی والی ہندی اردو شاعروں کے لیے مشعلِ ہدایت کا کام دے سکتی ہے سادگی میں پرکاری اسی کو کہتے ہیں۔

ضیا نے انگریزی شاعری سے متاثر ہو کر اسی رنگ میں اردو سانیٹ بھی لکھے ہیں۔ اور ماننا پڑتا ہے کہ اردو کے اس دور میں جس میں وہ لکھے گئے ہیں انھوں نے ایک بڑی کمی کو پورا کیا تھا۔ سانیٹ کے سارے تقاضوں پر ضیا کے یہ سانیٹ پورے اترتے ہیں۔ 'جوانی'، 'محبت'، اور 'دل' کامیاب سانیٹ ہیں۔

فنی اصطلاحات اور تکلفات برطرف میر اور فانی کا سوز، اقبال کا تفکر، ٹیگور کے گیتوں کی موسیقی اور ان کا فلسفیانہ انداز، پنجاب کی بے لوث

سادگی، اتر پردیش کی کوثر میں ڈھلی ہوئی زبان کا لوچ اور دہلی کے لطف محاورے یہ سب کچھ آپ کو ضیا کے کلام میں مل جائے گا۔ لیکن ضیا کے کلام میں جو ایک انسانِ صادق کا خلوص کارفرما ہے، وہ ہر شعر میں ضیا کی اپنی طبیعت کا آئینہ دار ہے۔ ایک صحیح اور حقیقی شاعر کی حیثیت سے ضیا نے جو کچھ دیکھا ہے، محسوس کیا ہے، سوچا ہے، سمجھا ہے، اور پایا ہے، اسے بڑی دیانتداری سے شعر کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اسی خلوص نے اس کے کلام میں جو تاثیر پیدا کر دی ہے، وہ ایک غیر فانی کشش اور سچی کیفیت کی حامل ہے۔ شاعر، شعر اور شعریت میں اخلاص کی یہ نئی روح ضیا کو اس سنگلاخ وادی اور ناشائستگی کے دور میں بھی صحیح راہ پر بہت آگے لے گئی ہے۔

تاب نظر اگر ہو، تماشا کریں کلیم
اب ہر طرف ضیا ہی ضیا انجمن میں ہے

ضیا کے بارے میں جناب اعجاز صدیقی (مدیر شاعر) نے صحیح لکھا ہے کہ اس نے ادب کے تمام نئے نظریات اور سارے بدلتے ہوئے رجحانات کو قبول کیا، لیکن اپنے سانچے میں ڈھال کر، اپنے ذاتی نظریات سے متوازن کر کے۔

ضیا نے پچھلے چند برسوں میں نظم و غزل کی صورت میں جو کچھ لکھا ہے، مندرجہ بالا رائے کی تصدیق کرتا ہے۔ غزل کے اپنے سانچے میں اس نے نئے افکار کو ڈھالا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ پختگیِ فن تو خیر، طبعی بات ہے، لیکن جدتِ افکار سے بھی اس پختہ و پرکارکشتہ سخنور نے نہ صرف نئی نسل کو چونکایا ہے بلکہ وہ اپنی انفرادیت اور آن بان کے ساتھ شعرائے جدید کے پہلو بہ پہلو رواں دواں ہے۔

وہ کہتا ہے:

روایتی پیکرِ غزل میں بھرا ہے رنگِ جدید میں نے
ضیا! مرے شعر میں مہیا کوئی نئی بات ہی ملے گی

جذبِ غم اور اس قدر یارو! کیوں نہ الفت کا ہو اثر یارو!
بھول جاتے ہیں حادثے دل سے نہیں جاتی کسک، مگر یارو!
دل میں باقی ہے جرأتِ پرواز
کیا ضروری ہیں بال و پر یارو!

ضیا کا ایک شعر ہے:

تنگ ہستی سے ہوں مرنا بھی ہے آساں، لیکن
کیا کروں رُوح سے لپٹی ہے بدن کی خوشبو

ایک نظم بعنوان "میری ساٹھویں سالگرہ" قدیم و جدید فکر و فن کا حسین امتزاج ہے۔ نظم کا پہلا بند ہے:

جگمگ جگمگ ساٹھ ستارے
توڑ کے گردوں کی ٹہنی سے
میں نے سجائے
آنگن کی دیوار میں اپنی

اور آخری بند ہے:

سوچ رہا ہوں
کیوں نہ میں ان کو
اپنی تجوری میں اب رکھ کر
تالا لگا دوں
اس پونجی کے سہارے ہی تو
مجھ کو ابھی زندہ رہنا ہے۔

ضیا اپنے کلام میں بدلتی ہوئی اقدار کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کا تازہ کلام

اس بات کا ثبوت ہے کہ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ اس کا اندازِ فکر بھی بدلا ہے۔ اس نے غزل کا نیا اسلوب بھی اپنایا ہے، جو اس کے دورِ اوّل کے اسلوب سے بہت مختلف ہے۔ ضیا نے جو کچھ آج کل لکھا ہے، اس کا اندازِ بیان نیا ہے۔ وہ ساٹھ سال کا ہو کر بھی فکرِ جوان رکھتا ہے۔

آخر میں اب اس کی غزلوں کے چند شعر دیکھیے:

آیا تھا کوئی حالِ وفا پوچھتا ہوا — خاموش ہو گیا، یہ مرے دل کو کیا ہوا
اچھا ہوا کہ تو نے بھلا ہی دیا مجھے — لیکن میں تجھ کو بھول گیا، یہ برا ہوا
تیری وفا جہاں کی وفا کی نوید تھی — تو بیوفا ہوا، تو جہاں بیوفا ہوا

توڑ کر جیل کل جو بھاگا تھا — اس کے پاؤں میں کچا دھاگا تھا
کھولتا آنکھ کیا اندھیرے میں — روشنی میں بھی میں نہ جاگا تھا
اے ضیا! مجھ سے میرا ہی سایا — رکھ کے کل سر پہ پاؤں بھاگا تھا

یوں حسرتوں کی گرد میں تھا دل اٹا ہوا
جیسے درخت سے کوئی پتا گرا ہوا
ملتا سراغ کاش کہ مجھے تیرے سایے کا
ہر سمت [illegible] جنگل اگا ہوا
باہر کے شور و غل ہی سے شاید وہ بول اٹھے
بیٹھا ہے کب سے چپ کوئی اندر چھپا ہوا۔

گربچن چندن

ضیا فتح آبادی

سے ایک ملاقات

ایک اچھے شاعر کی تخلیقات اسے ایسے مقام پر پہنچا دیتی ہیں، جہاں وہ ایک ماورائی شخصیت بن جاتا ہے۔ جب ہم اس کے کلام میں کوئی ایسا شعر پڑھتے ہیں۔

کرونگا جمع اک مرکز پہ ذرّاتِ پریشاں کو
نظامِ دہر کی بگڑی ہوئی قسمت بنا دُنگا

تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ایک غیر معمولی مخلوق ہے جس کی صلاحیت اور رسائی بے پناہ ہے، اور وہ انسان کو گھڑی بھر کے لیے اس کے مسائل اور مصائب سے نجات دلا سکتا ہے۔ لیکن مایوسیوں کو امیدوں کی جنّت عطا کرنے والا اور خوابوں کو الفاظ کے پیکر میں پیش کرنے والا شاعر بھی گوشت پوست کا ایسا ہی انسان ہوتا ہے، جیسے ہم آپ ہیں۔ میری اور آپ کی طرح وہ بھی مسائل اور حوادث سے پریشان، اس انتظار میں رہتا ہے کہ

جانے کوئی رام کب آ کر مجھے بھی دے نجات
ٹھوکروں میں ایک پتھر راہ کا ہُوں میں مجھے

کچھ ایسا ہی احساس مجھے مہر لال سونی ضیا فتح آبادی صاحب سے

مل کر ہوا۔
ضیا صاحب ایک قادر الکلام شاعر ہیں، یہ اندازہ مجھے ان کے مطبوعہ کلام ہی سے ہو گیا تھا۔ ایک طویل عرصے تک میرا ان سے تعارف ان کے کلام کے ذریعے سے بس غائبانہ ہی رہا۔ میرے دوست کرشن موہن مجھ سے اکثر ان کا تذکرہ کیا کرتے تھے، لیکن میری بدقسمتی کہ ان سے ذاتی ملاقات ایک زمانے تک نہ ہوئی اور پھر جب ایک دن ہماری ادبی مجلس کے ایک جلسے میں کرشن موہن نے انھیں مجھ سے ملایا، تو اس پہلی ملاقات ہی میں برسوں کا سفر طے ہو گیا۔ میرا اولین تاثر یہ تھا کہ وہ ایک صادق اور مخلص انسان ہیں، اور اپنے منکسر مزاجی پر شعری فوقیت کو غالب نہیں ہونے دیتے۔
اس مضمون کی تیاری کے سلسلے میں جس دن میں ضیا صاحب کا انٹرویو لینے کے لیے ان کے ہاں حاضر ہوا، تو وہ اپنے صاحبزادے کی شدید علالت کے باعث بہت پریشان تھے۔ ان کے بعض احباب بھی وہاں موجود تھے۔ ایسے ماحول میں ان سے بات چیت کا امکان دشوار تھا، لیکن میں نے جب لڑکے کی علالت کے بارے میں کچھ استفسار کرنے کے بعد رخصت چاہی، تو اسے ان کی عالی ظرفی کہیے یا ان کا خلوصِ شعری کہ انھوں نے مجھے اس کی اجازت نہ دی اور میرے سوالوں کا جواب دینے پر تیار ہو گئے۔
ضیا صاحب ۹ فروری ۱۹۱۳ء کو پنجاب کی سابق ریاست کپور تھلہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام مہر دین رکھا گیا تھا، جو بعد میں مہر لال ہو گیا۔ ان کا وطنِ مالوف فتح آباد (ضلع امرتسر، پنجاب) ہے، مگر انھیں بیک وقت دو تین ماہ سے زیادہ کبھی وہاں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ان کے والد کو ملازمت کے سلسلے میں مختلف مقامات پر جانا پڑا اور اہلِ خاندان سب ان کے ہمرکاب رہے۔ ابتدائی تعلیم اردو میں پائی۔ پہلے گھر

پر پڑھے۔ پھر تیسرے درجے سے پشاور چھاؤنی کے خالصہ مڈل اسکول میں داخل ہوئے۔ مہاراجہ ہائی اسکول، جے پور سے ۱۹۲۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۱ء میں ہندو سبھا کالج، امرتسر سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کر کے لاہور کے فورمین کرسچین کالج میں داخل ہو گئے یہاں سے ۱۹۳۳ء میں فارسی میں آنرز کے ساتھ بی۔ اے، اور ۱۹۳۵ء میں انگریزی ادب میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۶ء میں ریزرو بنک میں ملازمت مل گئی، جہاں سے مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد وہ جولائی ۱۹۷۱ء میں ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں شادی کی لیکن بیوی کی وفات کے بعد ۱۹۴۲ء میں دوسری شادی کرنا پڑی۔

اردو شعر سے بچپن ہی سے فطری رغبت تھی۔ ۲۱ سال کی عمر میں (۱۹۳۴ء) ان کا اوّلین مجموعۂ کلام قطعات کی صورت میں "طلوع" کے عنوان سے شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "نورِ مشرق" کے عنوان سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ یہ اردو نظموں کا غالباً پہلا مجموعہ تھا جس میں گیت اور سانیٹ شامل کیے گئے۔ ۱۹۳۸ء میں "ضیا کے سو شعر" چھپے اور ۱۹۵۲ء میں "نئی صبح" کے عنوان سے نظموں اور غزلوں کا مجموعہ شائع ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں "گردِ راہ"، ۱۹۶۶ء میں "حسنِ غزل" اور ۱۹۷۶ء میں "دھوپ اور چاندنی" کے عنوان سے دوسرے مجموعے شائع ہوئے۔ سات مجموعوں کی اشاعت کے علاوہ قریب نصف صدی سے ملک کے برگزیدہ جرائد اور رسائل میں ان کا کلام چھپ رہا ہے۔

اب وہ بات چیت سنیے، جو شعر اور شاعر کے بارے میں میرے اور ضیا صاحب کے درمیان ہوئی:

سوال: ضیا صاحب! آپکی اولین شعری تخلیق کونسی ہے؟ یہ آپ نے کب اور کس ماحول سے متاثر ہو کر کہی تھی؟

جواب: میں نے سب سے پہلے ۱۴ سال کی عمر میں ایک غزل کہی جس کا اب مجھے صرف مطلع ہی یاد ہے:

کیا ٹھہر سکتا فروغِ روئے جاناں دیکھ کر ہو گیا روپوش آخر مہرِ تاباں دیکھ کر

یہ پانچ سات شعر کی غزل تھی اور غالباً امرتسر کے ماہنامہ چمن کے اپریل ۱۹۲۹ کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ یہ غزل میں نے جے پور میں کہی تھی اور اصغر علی صاحب حیا نے، جو مجھے گھر پر اردو پڑھاتے تھے، اس پر اصلاح دی تھی۔ میں نے شعر کہنا انہی سے سیکھا اور انھوں نے عطا تخلص عطا کیا تھا۔ امرتسر منتقل ہو جانے کے بعد میں جناب فرخ امرتسری کا باقاعدہ شاگرد بن گیا اور انھوں نے میرا تخلص بدل کر ضیا رکھ دیا۔ اسی زمانے میں میں نے چند غزلیں جناب فیروز طغرائی کو بھی دکھائیں۔ انہیں دنوں اتفاق سے شاعر، آگرہ کا ایک پرچہ میری نظر سے گذرا اور میں ایک خط کے ذریعے سے ان کے مدیرِ اعلیٰ جناب سیماب اکبرآبادی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گیا۔ مجھے علامہ مرحوم کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت نہیں ملی اور سلسلۂ اصلاح بذریعہ ڈاک ہی جاری رہا، جو فارغ الاصلاح کر دیے جانے کے بعد بھی ان کی وفات تک نہ ٹوٹا۔

س: آپ میں شاعری کی خداداد صلاحیت ہے لیکن سنا ہے کہ آپ نے ابتدا میں شعر گوئی چھوڑ دینے کا ارادہ کیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اور پھر دوبارہ کس چیز نے آپ کو شاعری کی طرف مائل کیا؟

ج: میں ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں، جن کے ہر ہر قدم پر دشمن زیادہ اور دوست کم رہے۔ خاموش طبع اور تنہائی پسند ہونے کے سبب میں اکثر الگ تھلگ رہتا تھا۔ خوشامد کرنے کی صلاحیت یا

عادت مجھ میں کبھی پیدا نہ ہو سکی۔ طالبعلمی کے زمانے میں لاہور کے سرکردہ روزناموں میں میرا کلام چھپتا تھا، جس سے میرے بعض ہم جماعت بہت جلتے تھے۔ پھر مجھے اپنے ایف۔ سی کالج کے میگزین کے اردو حصّے کی ایڈیٹری مل گئی۔ اس سے بھی چند ہم جماعتوں کو، جو اس منصب کے آرزومند تھے، بہت جلن ہوئی۔ ان کے اپنے اپنے گروہ تھے، جن سے میں پرے پرے رہتا تھا۔ انھوں نے اسے میرا تکبر خیال کیا۔ اور طرح طرح سے میری مخالفت کی۔ کبھی اخباروں میں چھپنے والے میرے کلام میں کیڑے ڈالے اور کبھی کالج میں میرے خلاف پوسٹر تقسیم کیے۔ غرض انھوں نے میرے ذوقِ شعری کو مجروح کرنے کی پیہم کوششیں کیں۔ اس ماحول کا میرے نوخیز ذہن پہ بہت اثر ہوا اور مجھے اپنی شعری صلاحیت پر شک ہونے لگا۔ چنانچہ میں نے سیماب صاحب کے بڑے صاحبزادے منظر صدیقی کو ایک خط لکھا کہ میں شعر گوئی ترک کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے شدت سے میری رائے کی مخالفت کی اور مجھے شعر گوئی جاری رکھنے کی تلقین کی۔

س: آپ نے نظم، غزل، قطعہ، رباعی، سانیٹ، گیت، ہر صنفِ سخن میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ کیا آپ بتائینگے کہ آپ کونسی صنف کو اپنے ذوق کے سب سے قریب پاتے ہیں، اور کیوں؟

ج: یہ سوال بہت ٹیڑھا ہے۔ میں نے اپنی شعر گوئی کے اس پہلو پر کبھی زیادہ غور نہیں کیا۔ کچھ لوگوں نے میری نظموں کو پسند کیا، کچھ لوگوں نے غزلوں کو، اور کچھ نے دوسری اصناف کو۔ مجھے تو اپنی سبھی چیزیں پسند ہیں۔ میں نے سہرے اور تہنیت نامے بھی لکھے ہیں۔ میں نے کسی خاص صنف میں کوئی دشواری نہیں محسوس کی۔ شروع شروع میں میرے قطعات چھپے۔ اس زمانے میں قطعات کا بہت رواج تھا۔ چنانچہ میرا ذوقِ شعری ادھر مائل رہا۔ پھر مجھ پہ ہمعصر شعرا کا اثر ہونے لگا۔ ان میں اقبال، حفیظ، اختر شیرانی اور احسان بن دانش

سرفہرست تھے - یہ اردو کے تمام رسالوں پر چھائے ہوئے تھے۔ میرے مجموعہ "نو مشرق" میں ان سب کے اثرات ملیں گے - "انسان اور فرشتہ" اور "اے گل" اقبال سے متاثر ہو کر لکھی گئیں - گیتوں میں حفیظ اور راندر جیت شرما نے اور سانیٹ میں مجھے اختر شیرانی نے متاثر کیا - یہ ۱۹۳۱ سے ۱۹۳۵ تک کا وہ زمانہ تھا، جب میں لاہور میں رہا اور میرے اس ابتدائی دور میں ہمعصروں کے گہرے اثرات ہیں - میں ۱۹۳۶ میں دلی آگیا - ترقی پسند تحریک کا آغاز ہو چکا تھا - آزاد اور معریٰ نظمیں کہی جا رہی تھیں - چنانچہ میں نے اپنی حدود میں رہ کر ترقی پسند نظمیں بھی کہیں - ویسے میں کسی تحریک یا ازم سے وابستہ نہیں رہا - میں اپنی دھن میں مست ہوں - میں کس خاص صنف کا شاعر ہوں، اس کا فیصلہ ناقد ہی کر سکتا ہے - خود میں "نئی صبح" کو اپنی شاعری کا عروجی نقطہ سمجھتا ہوں -

س : زمانۂ شباب کی آپ کی بعض تخلیقات کچھ ایسے کردار پیش کرتی ہیں، جن کے بارے میں آج مزید جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے - مثال کے طور پر تصویر (۱۹۳۰)، دعوتِ نظر (۱۹۳۵)، مطربہ سے (۱۹۳۵)، ننجا ذاکی (۱۹۳۵)، اپنی میرا سے (۱۹۳۴)، اور حسینِ گمراہ (۱۹۳۲) جس میں ایک شوخ حسینہ آپ کو محبت کا پیغام دیتی ہے، لیکن آپ اس سے گریز کرتے ہیں - کیا آپ ان کرداروں پر کچھ روشنی ڈالنا پسند کریں گے -

ج : میں شروع ہی سے خلوت نشیں اور کم آمیز رہا ہوں - اسی کم آمیزی کے سبب لاہور میں قیام کے دوران میں حفیظ، اقبال اور اختر شیرانی ایسے شعرا سے بھی کبھی نہ ملا - میرا ایک شعر ہے :

کہہ کر غزل نو لائے تھے ہم بھی ضیا مگر اپنا کہیں شمار نہ تھا، دیکھتے رہے

میں نہ تو کسی گروہ میں شامل ہوا، نہ کبھی کافی ہاؤس کے ہنگاموں میں شریک ہوا - ایک خودداری سر پہ سوار رہی، میری زندگی میں کبھی ملاقاتوں کا سیلاب

بھی نہیں آیا۔ میرا ایک اور شعر بھی ہے:

کم آمیزی ہے اس کی خُو
کون ضیا سے ملنے جائے

سنجیدگی میرے کردار کا جزو لاینفک ہے، لیکن اس امر سے مجھے کوئی انکار نہیں کہ شاعر فطرتاً حسن پرست ہے۔ اس کی فطرت کے ساتھ اس کے عنفوان شباب کو دیکھیے، تو اس کے سامنے حسن ہی سب سے عمدہ منظر اور موضوع ہے۔ میں بھی حسین چہروں سے مسرور ہوتا رہا۔ لیکن میرا سرور فکر و نظر کی تہوں میں بند رہا۔ مزاج کی سنجیدگی نے پیش قدمی نہیں کرنے دی۔ اس زمانے میں مخلوط تعلیم کا رواج تو شروع ہو چکا تھا لیکن نسوانی آزادی زیادہ عام نہیں ہوئی تھی۔ کچھ شعرا نے تصوراتی پیکر تراش لیے تھے، جن میں اختر شیرانی کی سلمیٰ بہت مشہور ہوئی تھی۔ چلتے چلتے ایک دلچسپ بات سنیے۔ ہمارے کالج میں میرا نام کی ایک بنگالی لڑکی پڑھتی تھی۔ اس کے حسن اور غمزوں کا بہت شہرہ تھا۔ ہمارے مشہور ترقی پسند شاعر میرا جی نے اسی کے نام پر اپنا شعری نام رکھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ لڑکی شاعر کے تیر نظر کا کبھی شکار نہیں ہوئی تھی۔ میرا ایک ہم درس اس لڑکی پر جی جان سے فدا تھا اور اکثر مجھ سے اس کی باتیں کیا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ میرے رومانوی تخیل کا بھی ایک پیکر بن گئی۔ میری کئی نظموں میں اس کا نام آتا ہے۔ میرا سانیٹ "اپنی میرا سے" اسی سے منسوب ہے۔ میری جن دیگر نظموں کا آپ نے ذکر کیا ہے، ان میں کوئی حقیقی کردار نہیں ہے۔ البتہ وہ سب میرے ان تصورات کے مرہون ہیں جو حقیقی کرداروں سے پیدا ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے کردار ہر شاعر کے تحت الشعور میں اس سے ہنستے کھیلتے رہتے ہیں اور پھر خود بخود اس کے اشعار میں سطح پر آجاتے ہیں۔

ایف۔ سی کالج کے قیام کا ایک اور واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں:

ہمارے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر مرحوم بھی اسی کالج میں پڑھتے تھے۔ مجھ سے

سینیر تھے، اور غالباً کالج میگزین کے انگریزی حصے کے ایڈیٹر تھے۔ ان دنوں وہ اکثر انگریزی ہی میں لکھتے تھے۔ ان کا اردو کا ایک افسانہ میں نے اپنے اردو حصے میں چھاپا۔ یہ غالباً ۱۹۳۳ کی بات ہے۔ اس افسانے کا عنوان "تما دشو" تھا، اور میری دانست میں یہی ان کا اولین اردو افسانہ ہے۔

س: آپ ملک کے کئی مقامات پر رہے ہیں کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ کسی مقام کی بدولت آپ کے تخیل اور تصور کو کوئی خاص یا نئے گوشے ملے؟

ج: شاعر کا ذہن کبھی خاص مقام کا محتاج نہیں ہوتا۔ بقول غالب اس کے مضامین تو غیب سے آتے ہیں۔ البتہ اس کا ماحول اور گردوپیش اس پر اپنا اثر ضرور کرتے ہیں۔ میرا ابتدائی تخلیقی عمل لاہور میں ہوا، جہاں میں چار سال رہا۔ وہاں کے سب پرچوں میں جن میں ادبی دنیا، ادب لطیف، ہمایوں اور نیرنگِ خیال شامل تھے، میرا کلام شائع ہوتا رہا۔ میری بیشتر کاوشیں ادبی دنیا میں چھپیں۔ نیرنگِ خیال نے مجھے اپنے ایک مضمون میں تین منتخب، بااسلوب شعرا میں شامل کیا۔ دوسرے دو شاعر احسان بن دانش اور ساغر نظامی تھے۔ وفا رانبالوی، احسان بن دانش، اپندر ناتھ اشک اور فہیم بیگ چغتائی سے میری اچھی راہ و رسم تھی۔ جوش ملیح آبادی سے بھی میں پہلی بار لاہور ہی میں ملا، جب وہ ۱۹۳۴ء میں وہاں طلبا کی ایک کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس کی صدارت رابندر ناتھ ٹیگور نے کی تھی۔ سر جینی نیڈو بھی اس میں شریک ہوئی تھیں۔

۱۹۳۶ء میں جب مجھے ملازمت مل گئی، تو میں دلّی چلا آیا۔ یہاں سب سے پہلے منور صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کے علاوہ جوش، شاہد احمد، گوپی ناتھ امن، اور دیوان سنگھ مفتون سے بھی اچھے مراسم رہے۔ دلّی کا ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ میں نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام "طلوع" کا ایک نسخہ، جس کا دیباچہ ساغر نظامی نے لکھا تھا، نیاز صاحب کو بھی بھیجا۔ انھوں نے نگار میں اس پر بہت سخت تبصرہ لکھا، جس میں ساغر صاحب کو ان ارشادات

کے لیے بہت کوسا۔ بعد میں نیاز صاحب کو ریزرو بنک میں مجھ سے کچھ کام پڑا، جو میں نے پورا کر دیا۔ ۱۹۴۷ء میں میرا دوسرا مجموعہ "نور مشرق" شائع ہوا۔ میں نے اس کا بھی ایک نسخہ نیاز صاحب کو بھیجا۔ انھوں نے نگار کی آیندہ اشاعت میں ایک ایسا ستایشی تبصرہ لکھا جو ایک قصیدے سے کم نہ تھا۔

میں نے قریباً دس افسانے بھی لکھے، ان میں سے اکثر یہیں دتی میں لکھے گئے تھے۔ یہ بیسویں صدی، شمع، علیں، راہنمائے تعلیم، اور دستگیر نامی دتی کے جرائد میں شائع ہوئے۔ ان میں ایک افسانہ ملک کی تقسیم کے موضوع پر تھا؛ اس کا عنوان تھا: 'میں شرنارتھی ہوں'۔ میں افسانہ نویسی زیادہ دیر تک جاری نہ رکھ سکا کیوں کہ افسانہ بہت وقت چاہتا ہے۔

لاہور اور دتی کے علاوہ مدراس میں بھی، جہاں میں سات آٹھ برس رہا، میرا تخلیقی عمل وافر رہا۔ لیکن بمبئی نے میرے وجدان میں زیادہ تحریک نہیں پیدا کی۔ میں وہاں چار سال رہا، اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہاں شعرا کاروباری زیادہ ہیں۔ وہاں کے ادبی ماحول پر فلمی صنعت سوار ہے۔ جو صالح ادب کے فروغ کے لیے سم قاتل ہے۔ ادب وہاں کی رنگا رنگ منڈی میں ادیب کی تاجرانہ صلاحیت کے مطابق بکتا ہے۔ چند شاعروں نے اپنے اپنے حلقے میں دوسرے شاعر پال رکھے ہیں، جن سے وہ حسب موقع اور حسب ضرورت لکھوا لیتے ہیں۔ معاملہ نگار کی حیثیت سے نام ایک صاحب کا ہوتا ہے لیکن کام کوئی اور صاحب کرتے ہیں۔ وہ سب چلتا ہے "کی گردان سے سیٹھ کے بیٹھ اور مقاخر حلقہ ایک ایسا سلسلہ ہے جس میں میرے جیسے کم آمیز شاعر کی کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔

س: کیا کسی ایک زبان کے شاعر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ غیر ملکی شاعری کے اچھے مطالعہ سے بہرہ ور ہو؟ آپ کا اپنا تجربہ کیا ہے؟

ج: مطالعے کی وسعت سے ذوق تخلیق وسیع ہوتا ہے۔ کوئی شخص

طویل زمانے تک ایک ہی شہر میں مقیم رہے، تو اس کا نقطۂ نگاہ محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک دوسرا شخص جو شہر شہر گھوما ہو، اس کی نگاہ اور خیالات میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی حال شاعر کا ہے۔ ایجادات اور مواصلات کی کثرت کے اس دور میں تو وسعتِ مطالعہ اور بھی ضروری ہے۔ لیکن اس ضمن میں میرا اکتساب زیادہ تر انگریزی ادب ہی سے رہا۔ کیونکہ میں نے اسی زبان میں ایم۔ اے کیا تھا۔ شیکسپیر، مارلو، کیٹس، شیلے، اور بائرن سے مجھے خاص دلچسپی رہی۔ گھر میں میری زبان پنجابی تھی، دفتر میں انگریزی، تحریر میں اردو اور عرصۂ روزگار میں بنک کا دامن خشک۔ ان سب کے ساتھ میرے مزاج کی کم آمیزی ان تضادات کے سبب میں ادب کے مندر میں پوری تندہی سے عبادت نہ کر سکا۔

س: غزل کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے؟ کیا یہ عورت اور مرد کے عشقیہ معاملات ہی تک محدود ہے؟

ج: میں غزل کے بارے میں مہتاب صاحب کا مؤید ہوں۔ انھوں نے غزل میں غیر عشقیہ مضامین کی حدود دست بکل، سماجی اور سیاسی مسائل پر بھی غزلیں اشعار پیش کیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ غزل میں ہر قسم کے مضامین رقم ہو سکتے ہیں۔ فلسفہ اور تصوف بھی ان میں شامل ہیں۔ لہٰذا میں نے اپنی غزل میں سبھی موضوعات کو شامل کیا ہے۔ میں غزل میں غالب سے زیادہ متاثر ہوں۔

س: شاعر کی عظمت میں آپ نظم اور غزل میں سے کس کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں؟ کیا کسی بڑے شاعر کے تخلیقی کارناموں میں طویل نظم کا ہونا ضروری ہے؟

ج: عظمت کے لیے مصنف کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے، اور کیسے کہنا چاہتا ہے! اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائے، تو وہ بڑا شاعر ہے! کامیاب نہ ہو، تو اس کا مضمون یا موضوع خواہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، ہم اسے عظیم شاعر نہیں کہیں گے۔ میرے خیال میں بڑا شاعر بننے کے لیے

ہو یا نظم کہنا ضروری نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو کچھ کہا جائے، وہ بھرپور اور مکمل ہو۔ اگر اس میں کچھ تشنگی رہ جاتی ہے، تو شاعر عظمت کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر اس کے کامیاب اظہار کے لیے طوالت ضروری ہو، تو طوالت عیب نہیں ہے۔

س: شاعری کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے؟ کیا یہ صرف لذتیت اور جمالیاتی کیف ہی کا ایک ذریعہ ہے، یا اسے انسان کے دکھ درد کا مرہم بھی ہونا چاہیے۔

ج: شاعری کا کوئی نظریہ بتانا مشکل ہے، خاص طور پر مجھ جیسے شاعر کے لیے جس نے مختلف اوقات میں، مشاہدات و تجربات اپنی نگارشات میں سموئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں تضاد بھی مل جائے۔ میری شاعری نہ تو نظریاتی شاعری ہے، نہ کسی ایک ہی محور کے گرد گھومتی ہے۔ ویسے میں نظریاتی شاعری کا قائل بھی نہیں۔ ایسی شاعری زندگی کو اپنے مخصوص زاویے ہی سے دیکھتی ہے اور اس کے بقیہ رنگوں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ لذتیت کو میں اہمیت نہیں دیتا، لیکن جمالیاتی کیف کو شاعری کے لیے ضروری سمجھتا ہوں۔ شاعری کو انسان کے دکھ درد کا آئینہ کہا گیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ خود ہی انسان کے دکھ درد کا مرہم بن جاتی ہے۔ لیکن میں اسے کھلے طور پر اور عمداً مرہم بنا کر پیش نہیں کرنا چاہتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر شاعری قلب کو تسکین اور سکون نہیں پہنچاتی، تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہے۔ شاعری کے لیے ضروری ہے کہ وہ داخلیت اور خارجیت کا سنگم ہو۔ اسے ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کا ہو کر نہیں رہ جانا چاہیے بلکہ توازن قائم رکھنا چاہیے۔

س: کیا شاعر کو اپنے کلام کا نقاد بھی ہونا چاہیے؟

ج: میں یہ ضروری نہیں سمجھتا کہ ایک فطری شاعر فن کے تمام نکتوں سے بھی واقف ہو۔ شعر گوئی اور شعر فہمی کو میں الگ الگ خانوں میں رکھتا ہوں۔ البتہ میرا خیال ہے کہ ہر شاعر کو شعر فہم بھی ہونا چاہیے۔ اپنے کسی مجموعے کی اشاعت

سے پہلے میں اپنے کلام سے انتخاب کرتا ہوں۔ گذشتہ ۴۸ سال میں میرا جو کلام چھپا ہے میں نے اس سے کہیں زیادہ کہا ہے۔ میرے مطبوعہ کلام سے کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ میں بسیار گو نہیں ہوں۔

س: ایک غیر ملکی ادیب نے کہا ہے کہ نظم ایک پہیلی کی طرح ہے، جس کا حل پڑھنے والے کو نکالنا چاہیے! اس نظریے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: میں ابہام کو، جو جدید ادب میں نمایاں ہے، ادب کا جزوِ اعظم نہیں سمجھتا۔ کسی زمانے میں غزل کو اشارات کہا گیا تھا۔ پھر ہمارے ادب میں بھی ایک زمانہ آیا، جب ابہام گوئی یا ذو معنی اظہار کو فن کی معراج سمجھا گیا۔ بعد میں ہم نے اس کو ترک کر دیا۔ اب جسے جدیدیت کہتے ہیں، وہ ہمارے ماضی کی ایک صدائے بازگشت بھی ہے چنانچہ ہم انھیں چیزوں کا اعادہ کر رہے ہیں، جنھیں ہم ایک زمانے تک آزمانے کے بعد ترک کر چکے تھے۔ شعریت رمز میں ہے، بیانیہ طرز میں نہیں۔ اسی لیے شاعری طبعاً رمزیاتی ہوتی ہے۔ لیکن اس رمز کو پہیلی بنا دینے، یا خواہ مخواہ کا ابہام پیدا کر دینے ہی میں شاعری کی معراج نہیں ہے۔ وہ رمزیہ ہو یا ابہامی۔

س: اردو شاعری میں ترقی پسند تحریک کے کردار اور مقام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: میرے نزدیک یہ تحریک دراصل ایک سیاسی تحریک ہے۔ ہم نے اس میں سیاست کو ادب سے گڈمڈ کر دیا ہے، یا ادب کو سیاست کا رنگ دے دیا ہے، اور اس سیاست کو ہم افادی اور جدید کہنے لگے۔ ہمارے اردو شعرا کی پرانی غزلوں میں بھی جابجا ایسے اشارے مل جاتے ہیں جنھیں ترقی پسند کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر غالب، اور بہادر شاہ ظفر کے کلام میں سماجی اور سیاسی حالات کے بارے میں کئی اشارے ہیں۔ ایسے اشاروں ہی کی بدولت محققین نے غالب کی غزلوں کی تاریخیں مقرر کی ہیں۔ میرے خیال میں ادب پر

کوئی سیاسی یا سماجی قید و بند نہیں ہونی چاہیے۔ اسے ایسے تقاضوں سے آزاد ہونا چاہیے۔ اس کا کینوس جتنا وسیع ہوگا، ادب اتنا ہی عظیم ہوگا۔ ایک خاص مقصد سے وابستہ ہو جانے کے باعث ترقی پسند تحریک وسعت سے محروم ہو گئی۔ اس نے شاعری کو ایک ہنگامی شاعری بنا دیا جس کی اہمیت اور معنویت کا حالات میں تبدیلی کے بعد کم ہو جانا لازمی تھی۔ البتہ اس تحریک کی بدولت یہ ضرور ہوا کہ غدر کے بعد خوف اور سراسیمگی کے سبب ہمارے ادب میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا، وہ بہت حد تک ٹوٹ گیا۔ کچھ تازہ ہوائیں آئیں۔ کئی نئے دریچے کھل گئے اور شعرا کو کئی نئے موضوعات مل گئے۔

س: اردو کے قدیم اور جدید شعرا میں سے آپ کن سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے، یا کن کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں؟

ج: قدیم شعرا میں میرے نزدیک، سب سے اوپر میر اور غالب ہیں۔ ان کے بعد مومن ہیں۔ اگر میر بھی غالب کی طرح اپنے کلام کا انتخاب پیش کرتے، تو ان کا مقام اور بھی بلند ہو جاتا۔ میں انتخاب کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ میرے محبوب ترین شعرا میں اقبال، حالی، جوش ملیح آبادی، سیماب اکبر آبادی، یاس یگانہ چنگیزی، فانی بدایونی اور فراق گورکھپوری شامل ہیں۔۔۔

رام پرکاش راہی

"طلوع" سے "دھوپ اور چاندنی" تک

(ضیا فتح آبادی کا شعری سفر)

ضیا فتح آبادی کے یہاں زندگی کی ساتویں دہائی اور شاعری کی پانچویں دہائی ساتھ ساتھ چل رہی ہیں اور ان دو کی براہِ راست نسبت کو اگر نقد و نظر کے اعتبار سے ایک اکائی تصور کر لیا جائے، تو "طلوع" (مطبوعہ ۱۹۳۴ء) سے لے کر "دھوپ اور چاندنی" (مطبوعہ ۱۹۷۶ء) تک کی تصنیفات کی روشنی میں یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ موصوف زود گو یا بسیار گو شاعر ہیں۔ البتہ پُرگوئی اور پختہ گوئی کچھ ایسے پہلو ہیں، جن کی بنا پر ضیا کو امتیازی مقام دیا جا سکتا ہے۔ ۴۲ سال سے زیادہ عرصے میں موصوف کی کوئی سات تصنیفات منظرِ عام پر آئی ہیں جن میں سے صرف پانچ کسی حد تک مکمل کتابیں تسلیم کی جا سکتی ہیں اور ضیا کی ذہنی افتاد، تخلیقی تگ و دو اور فنی ارتقا کے مختلف گوشوں پر بتدریج روشنی ڈالتی ہیں۔

سب سے پہلے ان کتابوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صنفِ سخن، ہیئت، موضوعات، معروضات اور تاثرات کے اعتبار سے ضیا ہمہ جہتی فنکار ہے۔ اس نے قطعہ، رباعی، غزل، نظم اور گیت پر انہماک سے طبع آزمائی کی ہے، اور چونکہ رباعی،

قطعہ اور نظم کی پہنائی میں موضوع کی بوقلمونیت کے امکانات بہت زیادہ ہیں، اس لیے ضیا نے اخلاقیات، حب وطن، فلسفہ روحانیت، رومان، منظر نگاری، اور فطرت کی نقاشی جیسے گوناگوں موضوعات پر بڑی خود اعتمادی اور شائستگی کے ساتھ زورِ قلم کی گلکاریاں دکھائیں ہیں۔

ہر اچھے اور نمایاں ذکر شاعر کی طرح ضیا کا شعری سفر اور فنی ارتقا بھی ایک مخصوص پس منظر کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ خداداد صلاحیت، لاہور کی عمدہ تعلیم، اور اساتذہ وقت کا تبرک ــــ ان سب کا سنگم، اس عمارت کا چونا گارا ہے، جسے ہم اردو شاعری کی منظم اور مستند روایت کا نام دیتے ہیں۔ روایت کی بنیاد پر ایستادہ اور ماحول کے نقش سے تشکیل شدہ ضیا میں چھپی ہوئی فنی شخصیت استقامت کی اس منزل پہنچ گئی ہے کہ فصاحت، بلاغت، زبان و بیان پر قدرت اس کے صحتمند اور اٹوٹ انگ بن گئے ہیں، جن کے بل بوتے پر عمر کے انحطاطی دور میں بھی ضیا کی ذہنی دسترس، تخیلی جست، حسیاتی اُپج، فکری اجتہاد اور جذباتی سرگرمی اس کی شاعری میں نت نئے رجحانات اور عصری میلانات سمیٹنے کے درپے نظر آتے ہیں اور کسی حد تک خوب سے خوب تر کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔

ضیا فتح آبادی کو علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم کا شرف تلمذ ۱۹۲۹ء ہی میں حاصل ہو گیا تھا اور یہ سلسلہ، زیادہ تر خط و کتابت کی صورت میں استاد کی وفات تک جاری رہا۔ یوں آگرہ اسکول کا یہ دور نسبتاً دو، مگر اہم رکن لمبے عرصے سے شعری کاوش میں منہمک رہا ہے۔ یہ سفرِ واقعی طویل ہے، اور اس کی طوالت کا عمل اب بھی جاری و ساری ہے۔ اگر ماضی کے ماہ و سال کے تناظر میں دیکھا جائے، تو ریزرو بنک کی ملازمت کی چھاؤں میں یہ سفر اور بھی پُرپیچ، تہہ دار، اور کہیں کہیں کٹا پھٹا اور غیر منطقی بھی لگتا ہے۔ زود گوئی اور بسیار گوئی کی کمی اسی لیے ناگزیر تھی کہ ملازمت، تبادلہ، سفر، فرض شناسی، اور فرماں برداری کی الجھنیں

شاعر کی آزادہ روی اور تخلیقی دوڑ دھوپ کے لیے اکثر سدِ راہ ثابت ہوتی ہیں۔ البتہ معقول اور آبرومندانہ طرزِ معاش ایک ایسی نعمت ہے، جو شاعرانہ شخصیت اور مزاج کے کئی پہلوؤں کو اطمینان کی فضا میں پروان چڑھنے کے مواقع فراہم کرتی ہے اور شاعر کے لیے تخلیقی رزمگاہ میں حوصلہ اور ہمت کا تازیانہ بن جاتی ہے، جیسا کہ شیکسپیئر نے کہا تھا۔ Thrift is a blessing if man steal it not اور "روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر" کے مصداق ایلیٹ کی یہ بات بھی معنی رکھتی ہے کہ "اگر تمھیں شاعری کرنا منظور ہے، تو روزی کمانے کا کوئی اور ذریعہ اختیار کرو"۔ لہٰذا اعتماد اور عزت سے بقیدِ حیات رہنے کے ذریعے کو برقرار رکھتے ہوئے ضیا نے شعری میدان میں کتنی ریاضت کی ہے، اور کتنی وہ نہیں کر سکا، اس کی شاعری سے صاف ظاہر ہے، خاص کر جب ہم ضیا کے شعری سرمایے کو علامہ سیماب اکبر آبادی کے بعض دوسرے شاگردوں کے مقابلے میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر بھی مختلف پیرایوں میں جو کچھ بھی اس نے کہا ہے، ذاتی تجربے، حقیقی مشاہدے اور فطری محسوسات کی بنا پر حتی المقدور سوچ سمجھ کر کہا ہے۔ تلمذ کی گرفت کے باوجود اس کی شاعری میں اس کا اپنا رنگ و آہنگ کارفرما ہے، جو اس کی انفرادیت کا شروع سے آخر تک آئینہ دار ہے۔

انسانی تعلقات کی بنیاد محبت پر قائم ہے اور فارسی شاعری کی طرح اردو شاعری میں بھی، محبت کی بات چیت نے، غزل کا روپ دھارا ہے۔ تقریباً ہر اردو شاعر غزل ہی سے ابتدا کرتا ہے کیونکہ حساس انسان کے لیے عالمِ طفلی اور عالمِ جوانی جذباتِ محبت کے نشوونما کا زمانہ ہوتا ہے۔ اسی لیے کسی نے کہا ہے:

درسِ ادیب اگر بود زمزمۂ محبتے   جمعہ بمکتب آورد طفلِ گریز پای را

ہم دیکھتے ہیں کہ اردو شاعری کی تاریخ کا پہلا باب غزل ہے، اور غزل آج کے جدید دور میں بھی اتنی ہی مانوس اور مرغوب ہے، جتنی آغاز میں تھی، نہ صرف کہنے والوں

کے لیے بلکہ سننے والوں کے لیے بھی۔ ہاں، ایک بات ضرور ہے، کہ غزل کی سدا بہار دلہن ہر دور میں اپنے فطری حسن اور رنگ روپ کو قائم رکھتے ہوئے، نئی پوشاک زیورات اور دیگر لوازمات سے اپنے آپ کو آراستہ و پیراستہ کرتی چلی آئی ہے۔ ضیا فتح آبادی کے یہاں بھی غزل نے وقتاً فوقتاً چولا بدلنے کی کوشش کی ہے، لیکن ماضی قریب تک وہ روایت سے کوئی خاطر خواہ گریز نہیں کر سکا، اور آخر کار انہیں خود کہنا پڑا:

گھٹا بڑھا کے بھی دیکھا، مگر نہ بات بنی
غزل کا روپ، روایت پسند ہے، یارو!

دوسرے الفاظ میں یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ "نئی صبح" سے لے کر "دھوپ اور چاندنی" تک غزل کے میدان میں ضیا کا شعری معیار کم و بیش روایت کے تسلسل سے وابستگی، لب و لہجہ کی نرم آہنگی، احساس و فکر کا محتاط امتزاج اور غزل کے عام خد و خال کے تناسب اور موزونیت کا بیساختہ اور بےتکلف سلسلہ ہے۔ (۳۱) صورتِ حال، پر اس کے تغزل سے لبریز یہ اشعار شاہد عادل ہیں:

وہ آئے ہیں، تو میرے منھ پہ رونق کیوں نہ آجائے
بہار آتی ہے گلشن میں، تو غنچہ مسکراتا ہے
یکایک بند ہو جائے نہ دھڑکن قلبِ مضطر کی
مجھے پھر چاندنی راتوں میں کوئی یاد آتا ہے

جبر کا سب طلسم ٹوٹ گیا — جب ارادوں کی کائنات بنی
مری مجبوریاں، محرومیاں، لاچاریاں — حادثاتِ ناگہاں کو دیکھتا رہتا ہوں میں
دلوں کی راہ میں سب کچھ روا ہے — ضیا! تیری وفا، ان کی جفا کیا
مری رندی، مری ہستی کا حاصل — تری آنکھوں کے پیمانوں کی دنیا
عجب دائرہ ہے محبت کی دنیا — چلے تھے جہاں سے، وہاں آگئے ہم

درد دوا فروش ہے، ناز نیاز مند ہے — عشق کا انتظار ہے، حسن ہے انتظار میں

محبت، آرزو، آنسو، تبسم، حوصلہ، کوشش — فرشتے کچھ نہ سمجھینگے یہ مشتِ گل کی باتیں ہیں۔

رہِ پُر خار، بادِ تند، ہیبت ناک خاموشی — دلِ ناداں! یہی تو قربتِ منزل کی باتیں ہیں

ہزار بار ہی دیکھا ہے سوچنے کا مآل — ہزار بار ہی سوچا ہے، دیکھیے کیا ہو!

موت کا راز فاش تو کر دوں — زندگی کا بھرم نہ کھل جائے

جہاں سے قہقہے اٹھے تھے شاید — مرے آنسو بھی آئے ہیں وہیں سے

اُجالوں کو ڈھونڈو، سحر کو پکارو — اندھیروں میں رونے سے کیا فائدہ؟

ہوش ہوتا ہے، نہ کچھ اپنی خبر ہوتی ہے — ہائے، کیا چیز محبت کی نظر ہوتی ہے

اندھیروں سے دامن چھڑا تو لیا ہے — اجالوں سے بچ کر کہاں جائیے گا؟

فضا سہمی سہمی ہے، سانس اکھڑی اکھڑی — نہ اب آئیے گا، تو کب آئیے گا؟

مہ و مہر پر دام پھیلا رہا ہے — ترا بندہ، تیرے ہی سانچے میں ڈھل کے

سمجھ سکیگی نہ دنیا دلِ خراب کی بات — خموش ہوں کہ مجھے ہمزباں نہیں ملتا

اگر ہم پچھلے پانچ چھ سال کی حدِ فاصل سے ادھر ضیا کی شاعری کے بننے سنورتے نقوش کو دیکھیں، تو ایسا لگتا ہے کہ اس کے یہاں غزل کا مزاج ایک ایسے فن کو چھو رہا ہے جس میں جدیدیت کی ہلکی ہلکی ہفت رنگی کوششیں شوخ و شنگ دھنک کے منظم اور مستقیم روپ کی متلاشی ہیں۔ "دھوپ اور چاندنی" کی آخری اور مابعد کی غزلوں میں اس صورتِ حال کے جیتے جاگتے اور بولتے چالتے تیور ذیل کے اشعار میں موجود ہیں۔ ان شعروں میں موصوف کی عصری آگہی اور سماجی شعور کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ رویے میں ایک ایسا توازن ہے کہ اس میں روایت کی توسیع اور روایت سے گریز ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں:

منزل کا تو عرفان نہیں اتنی خبر ہے — جس سمت سے آیا تھا اسی سمت چلا ہوں

مدت ہوئی، گذرا تھا ادھر سے مرا سایہ — کب سے یونہی فرشِ رہِ خاموش پڑا ہوں

تھا قیامت دلِ ذرّہ کا ٹوٹنا — آسماں جل گیا، خاکداں جل گیا

ہر طرف شور کی دیوار دکھائی دے ہے — میری آواز بھی اب مجھ کو سنائی دے ہے
کھو چکا ہوں کسی تاریک گپھا میں خود کو — ٹوٹ کر میری انا مجھ کو دہائی دے ہے
سایہ سایہ مرے پیچھے ہے، کہیں دل کی نہ ہو — یہ جو آواز ہمہ وقت سنائی دے ہے

ہوئی سحر تو کہاں کھو گیا اجالے میں — جو رات بھر مرا دروازہ کھٹکھٹا تا رہا

کیا پاؤں حادثات کے پتھراؤ سے نجات — ہر سمت ہے محیط زمین آسمانِ وقت

پھاند کر جیل کل جو بھاگا تھا — پا نہ سکے اس کے کچا دھاگا تھا

ہجوم یاس، شب تیرہ، دردِ تنہائی — سکوں کجا، مجھے دل کا نشان نہیں ملتا

دھواں بھی نہ خاکستر دل سے اٹھے — فغاں کی صدا قہقہوں میں دبا دو

مٹھا تو ہے مجھ کو سمندر سمجھ کر — کوئی زہر بھی آنسوؤں میں ملا دو

غزلوں کے بعد قطعات اور رباعی کے بحرِ بیکراں میں ضیا کی غواصی اور پیرا کی سعیِ مشکور کے مرادف ہے۔ موضوعات کی رنگا رنگی کو اس نے اپنے ... بیانی، جمالیاتی شعور، وارفتگیٔ تصور، فطرت شناسی اور رجائیت کی گوناگوں ترجمانی کے ذریعے شعری پیکر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل رباعیات توجہ کے قابل ہیں:

... کی جوانی ہے جوانی میری — بوندوں کی کہانی ہے جوانی میری
... حوادث کی تسمیم ہے مجھ کو — موجوں کی روانی ہے جوانی میری

... دل، شب گیسو پہ نثار — جذبات کا پھیلاؤ، جوانی کا ابھار
... ٹپکتے ہوئے انگور کا رس — گالوں پہ دمکتے ہوئے پھولوں کا نکھار

... زلفوں میں گلِ تر کی مہک — بہکی ہوئی آنکھوں میں ستاروں کی چمک
... شباب سے دھڑکتا ہوا دل — بھیگی ہوئی ساری میں شراروں کی لپک

مہندی رچے ہاتھ، سرخ جوڑے کی کھنک — ماتھے پہ حیا کے کھلتے پھولوں کی دمک
گھونگھٹ کیے کھڑی ہے گوری جل میں — کہتی ہے، رہے سہاگ ہونٹوں میں جب تک

شفاف فضائیں، گنگناتی لہریں
انگڑائیاں لیتی وہ کنول کی شاخیں

اک خاص حیا کے ساتھ رس کی پتلی
اُتری ہے نہانے پاک سنگم جل میں

پلکوں کے طویل اور بوجھل سایے
نینوں کے دیوں سے نور مستی پائے

وہ نرم بدن کا لمس، وہ حسنِ شباب
سنگم کی روانیوں کو نیند آ جائے

ہر سمت ہے موت اپنے پر پھیلائے
بڑھتے چلے جاتے ہیں ڈرانے سایے

کیا زیست کی قدر، وہ سمے آ پہنچا
جب آنکھ میں فطرت کی بھی آنسو آئے

لاشوں کی سڑاند، جلتے ڈھانچوں کا دھواں
سہمے ہوئے سینوں میں گھٹی آہ و فغاں

اُو منتظرِ حشر! قیامت ہے یہی
پانی سے زیادہ خونِ انساں ارزاں

ہے فرش سے تا بعرش دیپوں کی قطار
بکھرا ہوا رنگِ گل ہے، رقصاں ہے بہار

ظلمتکدۂ دل مرا روشن ہو جائے
آ جاؤ جو دیوالی کا تم بن کے سنگار

خورشید کی کرنوں کا رباب آزادی
نغمات کی کلیوں کا شباب آزادی

صد رنگ سی شاعر کے تخیل کی دھنک
کھوئی ہوئی جنت کا ہے جواب آزادی

آفات سے ہم نہیں ہیں ڈرنے والے
ظلمات سے ہم نہیں ہیں ڈرنے والے

گردش میں زمیں و آسماں ہیں پیہم
دن رات سے ہم نہیں ہیں ڈرنے والے

تدبیر سے تقدیر بنانے والے
انسان کو نئے موڑ پہ لانے والے

روندے ہوئے ذرّوں پہ چھلکتی سی نظر
تاروں کی طرف پاؤں بڑھانے والے

غزل میں ضیا کا ملکہ روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے۔ رباعی میں اس کی غواصی اور بھی عمیق اور معنی خیز ثابت ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ نظم کہنے پر آتا ہے، تو اس کی شعری صلاحیت اور ذہنی دسترس اس صنفِ سخن کی منفرد جہات اور بسیط کینوس کا پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہے۔ چنانچہ موضوعات کی بوقلمونیت، تاثرات کی بے پناہی، خیالات کا ارتقاء، مشاہدات اور محسوسات کی ترجمانی اور پیکر تراشی کے علاوہ نظم کے میدان میں ضیا کی بسیار گوئی بھی کسی حد تک نمایاں ہے۔ "نورِ مشرق" محض نظموں کا مجموعہ ہے۔ "نئی صبح" اور "گردِ راہ" میں بھی منظومات کا پلڑا بھاری ہے

گویا اس کی جملہ تصنیفات کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ نظم میں ضیا نے ہیئت کی رنگا رنگی کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ پابند اور آزاد نظم کے علاوہ گیت میں بھی، اس نے بڑے وثوق اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے تخلیقی عمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ "نورِ مشرق" کی بیشتر نظمیں اس کے رومانی میلانات، مناظرِ فطرت کی تصویر کشی، وطن دوستی اور محبت کوشی کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں "کس طرح قرار ہو"، "خوبصورت ارادے"، "طلوعِ سحر"، "دعوت سیر" "بوندوں کا ساز"، "ہندوستان"، "ہندوستانی نوجوان سے" اور "ڈیوک آف ونڈسر" ممتاز نظمیں ہیں۔ "نئی صبح" کی منظومات میں ترقی پسند عناصر کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ موضوعات کی تہ میں عزمِ عمل، فکرِ فردا، احساسِ آزادی، تلقینِ جد و جہد کی جذباتیت کارفرما ہے۔ "گردِ راہ" میں ضیا نے پھر اپنے پسندیدہ موضوعات کو ہیئت کی رنگا رنگی، زبان و بیان کی برجستگی اور لہجے کی غنائیت کو برقرار رکھتے ہوئے بڑے حسنِ تکرار سے نباہا ہے۔ "خشت و سنگ" کے شعری اندوختے میں سموئی ہوئی نئی نظمیں اس کی ان کاوشوں اور سرگرمیوں کا نتیجہ ہیں، جن کی ترجمانی اس نے اپنی اس رباعی میں کی ہے:

میں حال کی زلفوں کے فسانے سن لوں
فردا کی ہواؤں کے ترانے سن لوں
اے وقت! ذرا تھم کہ کنارِ دل سے
بھولے ہوئے رنگین زمانے سن لوں

"صبح کا تارا"، "ہجر"، "میں اور چاند"، "سایے"، "یاد کی یاد"، "جنگِ آزادی کے بینام شہید" اس قبیل کی نمایندہ نظمیں ہیں۔ چھٹی دہائی کی سیر نظمیں چوتھی اور پانچویں دہائی کی نظموں کے درمیان رکھ دی گئی ہیں۔ ترتیب کی یہ کمزوری نظرِ ثانی کی محتاج ہے۔

نظم گوئی میں ضیا کا فن اور اسلوبِ اظہار پابند نظم میں اتنا دلپذیر نہیں ہے، جتنا کہ آزاد نظم میں۔ اس کا ایک سبب ہیئت کی تقلید بھی ہو سکتا ہے۔ پھر بھی پابند نظم میں ضیا کی انفرادی جولانیاں روایت کی حدود میں لازمی

طور پر اس وقت کی تہذیب کو منعکس کرتی ہیں۔ لیکن ضیا کا فنی معیار، اسلوبی اجتہاد، اور غنائی اظہار اس کی آزاد نظموں میں اس قدر نمایاں ہے کہ گنتی کی یہ نظمیں اُس کے ضخیم و کثیر پابند اور نظموں پر سبقت لے گئی ہیں۔ "نئی صبح" کے منشمولات میں "آخری بار"، "شیریں تلخی"، "فرار" اپنا جواب آپ ہیں۔ ذیل کے اقتباسات ضیا کے گہرے رومانی تاثرات، اخلاقی بلندی، اور عصری آگہی کی عکاسی کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں:

آخری بار ذرا اپنے حسین ہونٹوں پر
مسکراہٹ کی شعاعوں کو بکھر جانے دے
میں اندھیروں میں یہی نور لیے جاؤں گا۔ (نظم آخری بار)

تیرے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی یہ چیز ہے کیا؟
میں ترے دامِ زر و مال میں پھنستا نہیں
چاہِ ذلت میں ترے ساتھ نہ ڈوبوں گا کبھی
حربۂ اشک بھی بیکار رہا ہے
تیرا اقدام یہ تہذیب و تمدن کے خلاف
ناموافق بھی ہے، ناقابلِ تسلیم بھی ہے (نظم شیریں تلخی)

یہ تشنگی، یہ بھوک، جس کی انتہا کوئی نہیں
یہ جاگتے ہوؤں کے خوفناک لرزہ خیز خواب
یہ چیختی ہوئی فضائیں، روز و شبِ حیات کی
یہ بلبلاتی آرزوئیں قلب کے مزار پر
سکوں کا خون، بیقراریوں کی مانگ کا سہاگ
یہ وحشیانہ کوششیں حصولِ مدعا سے تنگ
فریب و مکر کے بچھے ہوئے ہر اک سمت جال
یقین کے پاؤں اور بدگمانیوں کی بیڑیاں

ازل سے آدمی اسی طرح اسیرِ زیست ہے (نظم فرار)

اسی طرح "گردِ راہ" کی آزاد نظمیں بھی گہرے اور دیرپا اثرات چھوڑتی ہیں۔ سماجی قیود و بند، ماضی کی تلخ یادیں، دوسری جنگِ عظیم کی اندوہناک پرچھائیاں آزادی کے روشن افق سے پھوٹتی ہوئی امید کی کرنیں، ضیا کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ نظموں کے مندرجہ ذیل ٹکڑے موصوف کی ندرتِ خیال، تنوع اور جاذبِ نظر طرزِ اظہار پر روشنی ڈالتے ہیں:

درمیاں میرے ترے، اے دوست! جو حائل ہے خلیج
جسمِ خاکی کو ہم آغوش نہ ہونے دیگی۔
کیا تجھے دیکھ سکونگا میں دریچے سے مدام!
اینٹ چونے کی یہ دیوار — یہ مکروہ سماج! (نظم دریچے)

شبِ تاریک میں، ظالم اندھیرے میں
کبھی وہ وقت آجائیگا، جب خورشید بھی مشرق سے ابھریگا
نویدِ دورِ نو لے کر
کٹینگے بندِ مجبوری (نظم طوفان)

مجموعی طور پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ضیا کا کلام اس کی اسی شخصیت کا آئینہ دار ہے جس میں اخلاقیات، سچی ہندستانیت، لطیف اور صحتمند رومانی رجحانات، انسانی اقدار اور اخوت کے بلند معیار کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ موصوف کے انتخابِ موضوعات اور اسلوبِ بیان میں فطری ذہانت، دلی خلوص اور تجرباتی شائستگی ہر سو کارفرما نظر آتی ہے۔ اردو ادب میں موصوف کا گرانقدر اضافہ اس بات کی دلیل ہے کہ ضیا کا دل و دماغ اب بھی وہی شاعر کا دل و دماغ ہے جسے عمر کے بڑھتے ہوئے مہ و سال سے کوئی واسطہ نہیں۔

ہے تجھی میں بقائے عمر کا راز
اے غمِ عشق! تیری عمر دراز

زرینہ ثانی

ضیا فتح آبادی اور احساسِ حُسن

ضیا فتح آبادی نے اپنی حالیہ غزل کے ایک مطلع میں کہا ہے:

بوڑھا درخت ہوں، مجھے جڑ سے اکھاڑ دو
میرا اپھٹا ہوا ہے لباس، اور پھاڑ دو

تو یہ ان کی کم مائیگی، بیبسی اور ناتوانی کا اظہار نہیں، بلکہ خود اعتمادی کے ساتھ کھلا ہوا چیلنج ہے کیونکہ ان کا فن اتنا پائیدار اور مستحکم اور ان کی غزلوں اور نظموں کی جڑیں اردو شاعری میں اتنی دور تک اور اتنی گہرائی تک چلی گئی ہیں کہ ان کا اکھاڑنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے؛ اب ان کی شاعری کے پیراہن کا ایک تار بھی ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتا۔

ضیا فتح آبادی کی شاعری تقریباً نصف صدی کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور دلچسپ کی بات یہ ہے کہ ان کی شاعری میں قدیم طرز اور ترقی پسندی کے اثرات کے ساتھ ساتھ جدیدیت کے صالح رجحانات بھی ملتے ہیں، اس لیے ہر زمانے کے تغیر کے ساتھ ان کی شاعری میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں اور یہ ایک ناگزیر سی بات ہے۔ اس تغیر کی زد سے نہ کوئی شخصیت محفوظ رہ سکتی ہے نہ فن۔

ضیا فتح آبادی مسلم تہذیب سے متاثر ہوئے اور اپنے مذہب سے وابستگی نے انھیں دیومالائی شعور عطا کیا۔ ان کے کلام میں جہاں آسمانوں کے تذکرے ملتے ہیں اور ملکوتی محبت کا حسن موجود ہے، وہیں ارضیت، نغمگی اور رس کی بھی کمی نہیں۔ فارسی شاعری کی تخئیل آفرینی، ژرف بینی اور نکتہ سنجی کے ساتھ ہندی شاعری کی غنائیت، ترنم اور محویت نے بھی ضیا کی شاعری کو انوکھا رنگ اور روپ بخشا ہے۔

ضیا کسی دیدہ ور کی طرح حسن سے متاثر ہوتے ہیں ان کی نظم "شاعر سجدے میں" ان کی حسن پرستی کی بیّن دلیل ہے۔ حسن سے استفادہ کرنے کا رجحان حسن پرست طبیعت کی دین ہوتی ہے۔ وہ حسن کو دنیا کے ذرّے ذرّے میں دیکھتے ہیں۔ ان کا حسن کا نظریہ کیٹس کے نظریۂ حسن سے مماثلت رکھتا ہے۔ حسن صرف مسرتوں، کامرانیوں اور شادمانیوں ہی میں مضمر نہیں، بلکہ غم و الم بھی اس حسن کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہی احساسِ حسن شاعر کو جذب و سوز عطا کرتا ہے، جس سے ایسے نغمات کی تخلیق ہوتی ہے، جو آفاقی اقدار کے حامل ہیں۔ اور جب انسان میں احساسِ حسن پیدا ہو جائے، تو وہ بے نیازِ مستیِ جام و سبو ہو کر اپنی ہستی کو عظیم بنا لیتا ہے اور اپنی ذات کے انکشاف کے لیے مستعد۔ ضیا کے یہاں بھی ذاتی انکشاف کا رجحان ہے، جو ہمیں فراق گورکھپوری کی یاد دلاتا ہے۔

اردو ادب میں ترقی پسند عناصر کی شمولیت ہمیں غدر کے بعد ہی سے ملنے لگتی ہے، اگرچہ ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اس نے ۱۹۳۶ء میں اختیار کی۔ ہر شے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ترقی پسندی بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی تھی۔ افراط اور تفریط کو نظر انداز کر کے ہم اس کے صالح عناصر کو مدِ نظر رکھیں، تو پتا چلیگا کہ بحیثیت مجموعی یہ ادب کے لیے صحتمند تحریک ثابت ہوئی۔ ضیا کے یہاں ترقی پسندی کے عناصر ملتے ہیں، مگر یہاں بھی انھوں نے

اپنی صالح طبیعت کی بنا پر اس کے منفی پہلو سے چشم پوشی کی ہے۔ فرار، احساسِ شکست، لذتیت اور قنوطیت سے ضیا کا کلام پاک ہے مثلاً ضیا اپنے ہمعصر میراجی کے معترف ہیں، مگر ان کے کلام کے منفی پہلو سے برگشتہ خاطر بھی ہیں۔ آپ کو ضیا کی پوری شاعری میں تقدس، تازگی اور زندگی ملیگی، جو صحتمندی کی علامت ہے۔ انھوں نے ابہام اور جنس پرستی کو کہیں بھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔

اہلِ ذوق و وجدان کی طرح انھوں نے بھی انسانی حسن سے اثر لیا ہے اور قدرتی مناظر کے حسن نے بھی انھیں اپنا شیدائی بنایا ہے۔ وہ قدرتی حسن اور انسانی جمال کو دیکھ کر بیقرار ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال ان کی نظم "کس طرح زار ہو" میں موجود ہے۔ شاعر کو جہاں سرودِ آبشار، جلوۂ عروسِ بہار، صحنِ لالہ زار، طلوعِ صبح، شعاعِ ماہتاب، فضاؤں کی مستیاں بیقرار کرتی ہیں، وہیں محبوب کے تبسم کی ادا، اس کے لبوں کا رنگ، اور اس کا قد و قامت بھی بیچین کرتا ہے۔ اور جذبۂ عشق شدت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن ضیا کے شباب کے زمانے کی لکھی ہوئی نظموں سے بھی ضبط کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ حسن کو دیکھ کر مچلتے ضرور ہیں، مگر ایک صحتمند اور توانا رجحان کے ساتھ۔ وہ حسن کے بے اعتبار اشاروں سے مسحور نہیں ہوتے، بلکہ جنوں کو ہمدوشِ خرد کر دیتے ہیں۔ ان کی نظم "حسنِ گمراہ" میرے دعوے کی تصدیق کریگی، حسن لاثانی سہی، مگر سرِ بزم حسن کی بیتابی اور بیباکی حسن کی تضحیک کے مرادف ہے۔ اس سے حسن میں وقار و عظمت باقی نہیں رہتی، جس سے تقدس اور توانائی عبارت ہے۔ حسن "حیا" سے جِلا پاتا ہے، اور ایسے ہی حسن سے شاعر مسحور ہوتا ہے اور مستفیض بھی۔

ان کی نظم "کرن" حسنِ فطرت کا بہترین مظاہرہ ہے۔ اس نظم میں پہلے فطرت کے حسن کا تذکرہ ہے، اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح کرن حسنِ فطرت کے ہجوم

سے گزر کر تیرگی کو تہس نہس کرتی ہوئی آتی ہے۔ [illegible] اور نا پایدار ضرور ہے۔ مگر کلی کا سینہ اس کا منتظر رہتا ہے کیونکہ کلی کرن کے جلوہ دلی ہی سے پُر نور اور معطر ہوتی ہے۔ اس کے بعد شاعر اپنے درد دل کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور کرن سے مخاطب ہو کر کہتا ہے :

اے کرن! مجھ کو عطا کر اک شعلہ نور کا
دے مرے ذوقِ نظر کو ظرف کوہِ طور کا
میرا دل مرکز بنے کیفیتِ مسرور کا
راز سارا کھول دوں میں ناظر و منظور کا

مادیت مطمئن ہو، روح تو کیا چیز ہے
میں بتا دوں گا کہ سب ناچیز ہے، ناچیز ہے

"نورِ مشرق" کا شاعر حسن کا گرویدہ ہے، اور اپنے خیالات کے اظہار کے لیے حسن ہی کا سہارا لیتا ہے، یہاں تک کہ وہ کوئی فلسفیانہ بات بھی کہتا ہے، تو اسی پس منظر میں۔ ابرِ بہار، گھٹائیں، انجمنِ گل، نغماتِ عندلیب، کلی کی چٹک، مہر و ماہ کی چمک، سورج کا تاجِ زریں، شاعر کے تخیل کو مہمیز لگاتے ہیں، اور وہ شاعرانہ وجدان سے کام لیتے ہوئے بڑے پتے کی باتیں کہہ ڈالتا ہے۔ چنانچہ "اے گل!" نظم اسی قبیل کی ہے۔ اس نظم میں شاعر دعوتِ غور و فکر دیتا ہے، پہلے وہ گل سے مخاطب ہو کر اس کی خامیاں گنواتا ہے۔ پھول، سوزِ لذت، حسنِ فطرت، گردشِ قسمت، وسعتِ عشق اور مسرت و یاس سے ناواقف ہے۔ اس لیے وہ اپنے رنگ و بو میں مست ہے، اور صبح و شام تبسم ریز وہ خود نما اور خود پرست ہے گویا:

خود ہی ساقی خود ہی میخانہ ہے تو   خود ہی بادہ، خود ہی پیمانہ ہے تو

اس کے بعد شاعر کہتا ہے:

مشرق سے آفتاب نے ضیا پاشی شروع کر دی، چار سُو نور ہی نور ہے، غفلت

کا دور دورہ ختم ہو چکا - دنیا کو سمجھنے کا وقت ہے - فنا دنیا کی سرشت میں ہے - بہاریں جاودان نہیں، اس لیے پھول کو اپنی فنا کا خیال کرنا ضروری ہے، تبسّم اور مسرت غلط ہے - شرابِ عشق و جنوں ہی سے سرورِ جاوداں حاصل ہو سکتا ہے - اسی لیے وہ کہتے ہیں:

دل میں کر مہمان اپنے سوز کو بھول جا فردا کو اور امروز کو

کیونکہ یہی سوز مضراب سازِ زندگی ہے؛ اسی سے بزمِ کائنات روشن ہے؛ دل اسی کی بدولت حرارت آشنا ہے، سارے جہاں کی تخلیق اسی کے تحت ہے؛ اسی سے سعیِ مسلسل جاری رہتی ہے، اور انسان کی کامرانی اور نشاطِ جاوداں کا راز اسی میں مضمر ہے:

میکشانِ درد کا ساقی ہے سوز حسن فانی ہے، مگر باقی ہے سوز

اس نظم کو تمثیلی نظم کہہ سکتے ہیں - پھول کے پیکر کو سامنے رکھ کر شاعر نے انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرف لطیف اشارے کیے ہیں - اور انسان کو عشق کی نظر پیدا کرنے کی دعوت دی ہے - کیونکہ تسخیرِ کائنات کے لیے عشق ضروری ہے اور تسخیرِ کائنات انسان کا منصبِ جلیلہ ہے -

اسی طرح حسن سے متعلق اہم اور موثر نظم "صبح کا ستارہ" بھی ہے - قطرۂ شبنم صبح کے ستارے سے سوال کرتا ہے کہ تو حسنِ شب کے لیے پیامِ اجل ہے اور تیرے وجود سے دوسرے ستاروں کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟

ستارے کا جواب مدلّل اور موثّر ہے، وہ کہتا ہے:

میں دیکھتا ہوں کہ انجام شب کا کیا ہوگا
مآل عشرت و عیش و طرب کا کیا ہوگا
پیام دیتا ہوں خطرے کا دہر والوں کو
پھر اپنی نذر حسین صبح کے اجالوں کو

ضیا نے فن کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی ہے کیونکہ وہ بھی اقبال کی طرح خونِ جگر کے بغیر نقش کو ناتمام اور نغمے کو سودائے خام سمجھتے ہیں۔ انھوں نے فن کی جمالیاتی قدروں کا لحاظ رکھا ہے مگر وہ افادی پہلو کو نظرانداز نہیں کر دیتے۔ جہاں ضرورت پڑی ہے، انھوں نے افادیت کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے؛ قوم میں بیداری پیدا کرنے کے لیے خطابی شاعری بھی کی ہے۔ مگر ایک بات یاد رکھنا چاہیے کہ جوش کے لہجے والی گھن گرج یہاں نہیں ملتی، بلکہ ان کے یہاں دھیمی دھیمی آنچ ہے، جو دلوں کو پگھلا سکتی ہے، توڑ پھوڑ اور طوفان بن کر آگے بڑھنے والا جذبہ نہیں پیدا کر سکتی۔ یہ رجحان ان کی حسن پرست طبیعت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

ضیا کی شاعری میں وہ تمام رجحانات اور میلانات، جو ملک میں جاری اور ساری رہے، پائے جاتے ہیں۔ ان کی نظموں میں جدید لہریں کروٹیں لیتی ہیں، مگر روایت کے احترام کے ساتھ۔ ان کے کلام میں بغاوت کی چنگاریاں ہیں، مگر تخریبی روش سے ہٹ کر اور جدت اور تازگی لیے ہوئے۔

ضیا خود اپنے مقام اور مقصد سے آشنا ہیں۔ اس کی وضاحت انھوں نے آج سے کوئی چالیس سال پہلے اپنی ایک نظم میں کی تھی۔ ان کے نزدیک شاعر کا نام لوحِ زندگی پہ درخشندہ ہے۔ تخیل سے کام لے کر وہ زندگی میں مسکراہٹیں بکھیر دیتا ہے۔ اس کی طبیعت کی روانی دریاؤں کی روانی کو مات کرتی ہے۔ وہ اپنی تخیل کی آنکھوں سے خزاں کا انجام دیکھ سکتا ہے، بجلی بن کر سینوں میں آتش فروزاں کر سکتا ہے، اور نورِ آفتاب بن کر تاریکی میں اُجالا بکھیر دیتا ہے، جس سے حیاتِ انسانی کا شبستان منور ہو جاتا ہے۔ ضیا نے اپنی شاعری میں اس مقصد کو مدِنظر رکھا ہے۔

رادھاکرشن سہگل

ضیاؔ فتح آبادی : میرا دوست

اگر انسان کے دل و دماغ کی مکمل ترجمانی اس کی زبان کر سکتی، تو خیالات و
جذبات کی تمام تر دنیا اس وقت تک شاعروں اور ادیبوں کے قلم سے صفحۂ کاغذ
پر آ چکی ہوتی؛ مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ انسان روزِ ازل سے سرگرداں و کوشاں
ہے کہ کسی طرح وہ ایسا کر سکے، ایسا کرنے کے لیے موزوں الفاظ مہیا کر سکے،
ان کا سرمایہ جمع کر سکے، اور ان کی ترتیب و نشست کا کام کر سکے؛ لیکن لگتا
ہے کہ اس کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ خیالات و جذبات کے سمندر
کو چھان کر سطحِ عام پر لانے کے لیے ایک اور سمندر کی ضرورت ہوگی، جو
خیالات و جذبات سے بھی زیادہ اتھاہ، عمیق اور وسیع ہو۔ مگر ایسے
سمندر کی تخلیق انسانی ذہن کی حدوں سے باہر رہے گی۔ جہاں مجبوری اور
معذوری کا یہ عالم ہو، وہاں مجھ ایسے انسان کے لیے ضیاؔ کے سے دوست
کی شخصیت بیان کرنے کی غرض سے مناسب الفاظ کا فراہم کرنا، اگر نا ممکن نہیں تو مشکل
ضرور ہے۔ لہٰذا اگر میں اس فریضے سے پوری طرح عہدہ برآ نہ ہو سکوں، تو قارئین مجھے
معاف فرمائیں گے یہ سمجھ کر کہ میرا یہ اقدام نسیمِ سحری کے اس جھونکے کی طرح ہے، جس کا گزر ابھی
ابھی پھولوں سے لدے کسی چمن زار میں ہوا ہو، جو اس کی کچھ نکہت تو اپنے ساتھ

اڑالایا، مگر رنگ نہیں۔ نکہت و رنگ کو کلیتہً بیان کرنا قلم کی قلمرو کے باہر ہے۔
۱۹۶۶ء کی بات ہے کہ ایک روز میرے لڑکے جواہر کے ساتھ اس کا ایک دوست ہمارے یہاں آیا، جسے اس نے رویندر رسوتی کہہ کر مجھ سے ملایا۔ بعد میں رویندر اکثر و بیشتر جواہر کے ساتھ آتا رہا۔ رفتہ رفتہ مجھے پتا چلا کہ رویندر کو اردو علم و ادب سے لگاؤ ہے۔ مجھے بھی اردو شعر و شاعری کا بچپن سے شوق ہے، مگر اپنی دفتری مصروفیات کے باعث میں ایک زمانے تک اس شوق کی پوری پذیرائی نہ کرسکا۔ میں اپنے طور پر شعر کہتا رہا اور کبھی کبھی نجی اور نیم پبلک جلسوں میں پڑھتا اور داد بھی حاصل کرتا رہا۔ ایک روز باتوں باتوں میں کھلا کہ رویندر رسوتی، ضیا فتح آبادی کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ ضیا کا کلام اخبارات و رسائل میں اکثر میری نظر سے گزر چکا تھا۔ قدرتاً ان سے ملاقات کی خواہش ذہن و دل میں ابھری۔ مگر یہ خواہش پوری نہیں ۱۹۶۹ء میں ہوسکی، جب وہ بمبئی سے تبدیلی کے بعد دلّی تشریف لائے۔ ان سے ایک مرتبہ ملنے کے بعد ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری ہوگیا اور یہ اس وقت اور بھی بڑھ گیا، جب انھوں نے راجوری گارڈن، نئی دلّی میں "بزمِ سیماب" کی بنا ڈالی اور اس کے ارکانِ انتظامیہ میں مجھے بھی شامل کرلیا۔ ان دنوں میں بزم کا ایڈیشنل سکریٹری ہوں۔ یہ ضیا کی ہر دلعزیزی اور ادب نوازی کا ثبوت ہے کہ اتنے قلیل عرصے میں ہم نے نہ صرف ایک یادگاری تقریب "یومِ سیماب" کی صورت میں منائی بلکہ ایک ادبی تخلیق بھی بعنوان "شعر اور شاعر" بزم کی اولین پیشکش کی شکل میں شائع کرچکے ہیں۔ ضیا کے قریب آکر مجھے ان کے کردار اور فن کے سمجھنے اور پرکھنے کے بیشتر مواقع ملے۔

میں نے عام طور پر کسی شخص سے مرعوب ہونا نہیں سیکھا۔ اسی لیے مجھے ضیا ایسے مشہور و معروف فنکار سے ملنے میں کچھ تامل ضرور تھا۔ مگر ان سے پہلی ہی ملاقات میں گویا تمام حجابات اٹھ گئے۔ ایسا معلوم ہوا، جیسے ہم مدت سے ایک دوسرے کو بخوبی جانتے پہچانتے ہیں۔ ضیا اکثر کہتے ہیں اور یہ ہے بھی ایک آفاقی حقیقت کہ فنکار دل

ہیں ایک طرح کا روحانی رشتہ ہمیشہ قائم رہتا ہے، وہ ایک دوسرے سے کبھی ملیں، یا نہ ملیں، وہ ایک دوسرے سے واقف ضرور ہیں۔ ضیا کی شخصیت اور ذہانت اور ان کے حسنِ سلوک اور ان کے علمِ شعر کی گہرائی سے میں اس حد تک متاثر ہوا کہ میں ان کو استاد سمجھنے لگا۔ بیشک، عمر میں وہ دو چار برس مجھ سے چھوٹے ہیں، لیکن شاعری میں انھوں نے جو مقام حاصل کر لیا ہے، اس کا اندازہ کرنے کے بعد میں ان کا شاگرد بننے کے لیے تیار ہو گیا۔ جب میں نے ان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا، تو یہ جان کر مجھے اچنبھا ہوا کہ وہ نہ استاد بنتے ہیں، نہ کسی کو شاگرد بناتے ہیں۔ ضیا صاحب کہنے لگے کہ استاد بننے کی جو روایتی صفات ہیں، وہ ان میں موجود نہیں۔ سب سے ضروری صفت جس کی طرف انھوں نے اشارا کیا، عروضدانی ہے، لیکن میں اس کا مطلب یہ سمجھ سکا کہ اس سے ان کی مراد "عروضدانی کے لوازمات" سے ہے کیونکہ ایسا تو نہیں کہ وہ عروض سے واقعی نابلد ہوں۔ انھوں نے ۱۹۳۳ء میں بی اے فارسی آنرز کا امتحان پاس کیا، تو اس کے لیے باقاعدہ عروض کی تعلیم بھی حاصل کی۔ یہ اور بات ہے کہ ازاں بعد غیر ادبی پیشہ اختیار کر لینے پر انھوں نے اس علم پر کوئی خاص توجہ نہیں کی، اور شعر کہنے میں اپنی موزونِ طبعی ہی کو کافی خیال کیا۔ بہر حال میرے اصرار پر انھوں نے مجھے مشورہ دینا منظور کر لیا، اور میں نے تھوڑے ہی عرصے میں دیکھا کہ ان کی ہدایت اور رہبری میں میرے سوچنے اور شعر کہنے کا ڈھنگ بدلنے لگا ہے۔ اور آج خود مجھے اپنی کامیابی پر حیرت ہوتی ہے۔ ضیا کے نزدیک کوئی ادبی تخلیق بے مقصد نہیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ شعر مدلّل اور بامقصد ہونا چاہیے، خیال خواہ نیا ہو یا پرانا۔ غور سے دیکھا جائے، تو کوئی خیال کلیۃً نیا ہوتا بھی نہیں۔ ہاں، اگر اندازِ بیان اچھوتا ہو، تو خیال بھی نیا معلوم ہونے لگتا ہے۔ ضیا معاملاتی شاعری پر واردات شاعری کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اشارے اور کنایے سے شعر کی زیب و زینت میں اضافہ ضرور ہو جاتا ہے، مگر ابہام عیب ہے! الفاظ موزوں اور مناسب ہوں تو شعر کا اثر خود بڑھ جاتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں، اور مجھے ان سے کامل اتفاق

ہے کہ زبان نہ جامد ہے، نہ کسی کی جاگیر؛ زمانے کے تقاضوں کے مطابق زبان میں ردو بدل ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ لیکن جان بوجھ کر کوئی لسانی غلطی کرنا ترقی پسندی ہے نہ جدیدیت پرستی۔ ضیا ادب اور شعر کو ایسے خانوں میں محدود کرنے کے حق میں نہیں جہاں کسی نئے خیال کا گزر نہ ہو سکے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ادب اپنے زمانے کی اپج اور ادیب کی ذہنی اور ادبی کیفیتوں کا آئینہ دار ہے اور وہی ادب ادب کہلانے کا مستحق بھی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم میر کا غالب سے یا غالب کا داغ سے موازنہ کر کے کوئی حکم لگا سکیں۔ یا علیحدہ علیحدہ اسکول قائم کریں۔ ضیا کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے، علم و ادب کے کئی راز مجھ پر منکشف ہوئے اور مجھے اس اعترافِ حقیقت میں کوئی باک نہیں کہ ان کی رہبری میں میری شاعری نے چند ہی برس میں وہ ترقی کی ہے، جو اس سے پہلے نہیں کی تھی۔ لیکن آج میرا موضوع ضیا کی شاعری یا فن نہیں، بلکہ ان کی شخصیت ہے۔

میرا عقیدہ یہ ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کی شخصیت کو اس کے فکر و فن سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی کوشش علم نفسیات کی رو سے تو غلط ہے ہی، شاعر کی ذات سے بھی ناانصافی ہے، اور اسے صحیح طور پر سمجھنے کی راہ میں ایک رکاوٹ بھی ہو سکتا ہے کہ مندرجۂ بالا سطور اسی عقیدے کے زیر اثر لکھی گئی ہوں۔ تاہم ضیا کی شخصیت سے متعلق یہ خاص بات میرے تجربے میں آئی کہ وہ قریب ہوتے ہوئے بھی دور رہتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ انھوں نے دوست نہیں بنائے یا کوئی ان کا دوست نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ دوستی اور خلوص کو زندگی میں بڑی اہمیت دیتے ہیں جب ان کا کوئی دوست کسی وجہ سے خفا ہو جاتا ہے یا ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیتا ہے، تو انھیں انتہائی ذہنی اور دلی کرب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ "ایک بار دوست، ہمیشہ دوست" ان کا اصول ہے۔ لیکن سادہ لوح اتنے ہیں کہ بیشتر اوقات نامہربان کو مہربان اور دشمن کو بھی دوست سمجھنے لگتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ اس صورت میں وہ قریب آکر دور کیونکر رہ سکتے ہیں؟ بات یہ ہے کہ وہ دوستوں میں پوری طرح سے گھل مل نہیں جاتے۔ دوسرے لفظوں میں وہ بےتکلفی نہیں برتتے، وضعداری کے قائل ہیں۔

منور لکھنوی نے ضیا سے متعلق ایک بار فرمایا تھا:

ہے مری مانند کچھ اس میں بھی خودداری کی بُو
بندۂ اخلاص کی رہتی ہے اس کو جستجو

اور خود ضیا نے بھی کہا ہے:

کون ضیا سے ملنے جائے کم آمیزی ہے اس کی خو

فطرتاً وہ گھر گھسنے آدمی ہیں۔ جب تک ملازم رہے، گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر ان کا معمول رہا۔ اب ریٹائر ہو جانے کے بعد صرف "گھر" رہ گیا ہے۔ گھر سے باہر نہیں نکلتے۔ معالجین کے مشورے اور دوستوں کے اصرار پر صبح کی سیر شروع کی تھی، لیکن یہ سلسلہ بھی زیادہ دن نہ چل سکا۔ دن شطرنج اور شام ٹیلی ویژن کی نذر ہو جاتی ہے، یا پھر ہر وقت کسی عزیز اہلِ سخن کو مشورۂ سخن دینے کے لیے تیار ہیں۔

استغنا و بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ مجھے اپنی ۶۵ سالہ زندگی میں یہ چیز بہت کم دوستوں میں دیکھنے کو ملی ہے۔ پسِ پشت کسی کی برائی نہیں کرتے، چغلی سننا پسند نہیں کرتے۔

ضیا مہمان نوازی اور رکھ رکھاؤ کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ جس خلوص اور عقیدت سے شریمتی ضیا اور ان کے لڑکے رویندر اور گھر کے دوسرے افراد مہمانوں کی خاطر مدارات کرتے ہیں، اس کی مثال آپ کو آج کی بدلتی قدروں کے زمانے میں بہت کم ملیگی۔ اس پر ضیا کا ایک شعر یاد آگیا:

آؤ تو ذرا یہ پوچھ ہی لیں، ہر روز بدلتی قدروں سے
انساں نہ ملیگا جب کوئی، وہ عالمِ انساں کیا ہوگا!

گھر کا تمام کام کاج شریمتی ضیا کے ذمے ہے، یہاں تک کے ضیا کے ملبوس کا انتظام و اہتمام بھی وہی کرتی ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں کبھی دخل نہیں دیا، ان کا مستقبل بنانے کی فکر بھی نہیں کی۔ کہنے کو تو کہتے ہیں کہ تدبیر سے تقدیر بدل سکتی ہے، مگر تقدیر ہی پر پورا وشواش رکھتے ہیں، شاید یہ علم جیوتش میں دسترس اور یقین کے باعث ہو۔ انھیں معلوم ہے کہ میں جیوتش کا قائل نہیں، اس لیے اس مضمون پر

ہمارا کم ہی تبادلۂ خیالات ہوتا ہے۔ ضیا اپنے خیالات یا عقیدہ کسی پر تھوپنا نہیں جانتے۔ طبیعت میں آرام طلبی کو زیادہ دخل ہے۔ لکھنے پڑھنے کا کام بھی بیشتر لیٹ کر کرتے ہیں۔ آج کل علامہ سیماب پر کام کر رہے ہیں۔ استاد کے لیے دل میں بے پناہ عقیدت ہے۔ انھیں شکایت ہے کہ سیماب کے ادب نواز اور با صلاحیت تلامذہ اور لواحقین میں سے کسی نے سیماب کے ادھورے کاموں کے پورا کرنے میں مناسب دلچسپی نہیں لی۔

ادھر دو چار برس سے ضیا کی بینائی کمزور ہو گئی ہے؛ وہ اچھی طرح لکھ پڑھ نہیں سکتے مگر ڈاکٹر کو آنکھیں دکھا کر نئی عینک بنوانے کی نوبت نہیں آئی۔ دنیا کو بھی آنکھیں کم ہی دکھاتے ہیں؛ ایک مرتبہ بس میں ضرور اتفاق ہوا تھا ایک منچلے نوجوان کو انھیں آنکھیں دکھانے کا! اور میں دیکھتا ہی رہ گیا کہ کس جرأت اور حوصلے سے وہ اس سے الجھ گئے تھے۔

کھانسی اور نزلہ کا زور جب حد سے بڑھ جاتا ہے، تو انھیں زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑتا ہے۔ ورنہ جو دوا شریمتی ضیا دے دیں، وہی استعمال کر لیتے ہیں۔ خود عمر بھر شراب اور سگریٹ کو منھ نہیں لگایا، اس کے باوجود ان نعمتوں کے دلدادوں سے کسی قسم کی نفرت نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک برائی اور بھلائی کے معنی کچھ اور ہیں؛ خوراک میں بعض دالیں اور ترکاریاں اور دہی کھاتے ہیں؛ پھلوں میں آم اور خربوزے کے بیحد شوقین ہیں؛ مٹر اور آلو بھی پسند کرتے ہیں، مرچ، بینگن اور لوکی سے نہ جانے کیوں نفرت ہے! حتی الامکان کھانا وقت پر کھانے کے عادی ہیں۔ چائے دن بھر پیتے رہتے ہیں؛ چائے نوشی گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہے، لیکن وہ چائے کے غلام نہیں، نہ ملے، تو ان کے سر میں درد نہیں ہوتا، نہ جسم ہی ٹوٹنے لگتا ہے۔ لیکن مل جائے تو کیا بات ہے! پیالی کو ہونٹوں سے اس طرح لگاتے ہیں گویا برسوں کے بچھڑے ملے ہوں۔

تمام عمر روپیہ کمایا۔ ان کی زندگی ریزرو بنک میں گزری ہے۔ ریزرو بنک کی

روایت کے مطابق دیانتداری ان کی فطرت کا اہم جزو بن گئی۔ اپنے والد کے پاس بھی انھوں نے لاکھوں دیکھے۔ لیکن ان میں سے انھیں کچھ نہ ملا۔ اگر وہ چاہتے، تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن انھوں نے استغنا سے کام لیا۔ وہ اپنی ذاتی استعداد سے بنک میں اسسٹنٹ چیف آفیسر کے عہدے تک پہنچے اور جب ریٹائر ہوئے، تو ڈھائی ہزار روپیہ ماہانہ پاتے تھے۔ انھوں نے اپنی کمائی سے سہ منزلہ مکان تعمیر کیا اور زندگی کو آسودہ بنایا۔ ایسا نہیں کہ انھیں زمانے کی ناسماعدت سے سابقہ نہ پڑا ہو۔ لیکن انھوں نے اپنی تکالیف کی تشہیر نہیں کی! وہ شور مچانا نہیں جانتے

مجھے معلوم ہے کہ کچھ عرصہ پہلے جب ان کے صاحبزادے رویندر سوئی گوناگوں مصائب کا شکار تھے، تو انھوں نے اپنی تکالیف کا ذکر مجھ سے کبھی نہیں کیا، گویا وہ غم کی "شیرینی" سے تنہا ہی لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔

ضیا کی ایک بری عادت کی طرف اشارہ کر کے میں اس مضمون کو ختم کر دوں گا۔ میرا تجربہ ہے کہ جب کبھی ضیا بحث میں کھو جاتے ہیں، تو وہ دوسروں کو اظہار خیال کا موقع بہت کم دیتے ہیں، بس اپنی کہے جاتے ہیں۔ شاید وہ اسے بری عادت نہ سمجھتے ہوں، لیکن میں سمجھتا ہوں۔ میرا ایک شعر ہے:

روئے جاناں پہ تل اگر ہے، تو کیا!
چاند میں بھی تو داغ ہوتا ہے

رفعت سروش

تصویر کی تلاش

میری تصویر

مری نظم کا عنوان عجیب

آپ یہ نظم سنینگے، تو پریشاں ہونگے

کیونکہ یہ نظم تو ہے

نظم کا موضوع بھی ہے

لیکن اس نظم کے فنکار کی ۔۔۔۔ ابھی میری

دستِ نقاش نے کھینچی ہی نہیں

کوئی تصویر ہنوز

میں نہیں ہونگا جب اس دنیا میں

میری اس نظم کو پڑھ کر احباب،

کسی فردوسِ تخیل میں پہنچ جائینگے

اور صادرِ نادرِ تصویر کی قلمکاری سے

اپنے اس صفحۂ دل پہ کوئی

میری تصویر بنا ہی لینگے

میری تصویر مری نظم کے ہر لفظ میں ہے۔
مجھے اس نظم کے خالق کی تصویر کی تلاش ہے، ہر چند کہ میں نہ نقاد، نہ قلمکار۔ میں تو ایک حسن پرست ہوں، اور حسن کی تلاش ہی میں فردوسِ تخیل میں پہنچنا چاہتا ہوں۔
اس تصویر کی تلاش مجھے ماضی کے نہاں خانوں میں لے جاتی ہے اور اس شاعر کے تخیل کے سہارے اس کے ذہن کی پہنائیوں میں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔
ہندستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ آزادی کی جدوجہد جاری ہے۔ ملک میں بےچینی اور بغاوت کے آثار ہیں۔ چھوٹے بڑے سب حب الوطنی کے نشے میں سرشار ہیں۔ اس نشے میں سرشار صحافی، شاعر، افسانہ نگار، ہر قلمکار آزادی کی تصویر بناتا ہے، اور اپنے اپنے تخیل کے رنگ اس خیالی تصویر میں بھرتا ہے۔ ملک انقلاب کے لیے تیار ہے۔ راوی کے کنارے مکمل آزادی کی قرار داد منظور ہو چکی ہے۔ راوی کی فضاؤں سے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کہنے والے شاعر کے نغمے بلند ہو کر ملک بھر میں گونج رہے ہیں، اور یوں شاعرِ مشرق کی صدائے بازگشت ہندستان کے کونے کونے میں سنائی دے رہی ہے۔ ہر نیا شاعر اس کی آواز میں آواز ملانا چاہتا، اس کے رنگ میں شعر کہنے کو طرۂ امتیاز سمجھتا ہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے، جنھوں نے اس کے الفاظ کی لے سے لے تو نہیں ملائی، تاہم اس کے جذبِ دروں کو اپنا کر ایک الگ لہجہ اختیار کر لیا؛ یوں چراغ سے چراغ جلنے لگے۔
میر انیس کی سرزمین سے ایک اولوالعزم شاعر کمال جوش سے نغمے الاپتا ہوا سر بلند ہوتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے افقِ شاعری پر چھا جاتا ہے۔ تاج محل کی روپہلی چھاؤں سے نغمگی لے کر ایک شخص سیماب صفت محفلِ شعر میں آتا ہے اور اپنے نغموں کا جادو جگا دیتا ہے۔
اور اس میخانۂ نظم میں اقبال اور جوش اور سیماب حب الوطنی کی صہبا چھلکاتے ہیں۔ اسی سہ رنگ صہبائے نظم کا رنگ اول اول اس شاعر کی تصویر کے پسِ منظر

میں ملتا ہے جس کی تصویر کی مجھے تلاش ہے اور میں "نورِ مشرق" کی مشعل لے کر اس کے خد و خال تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بیس بائیس سال کا یہ نوجوان ضیا فتح آبادی کس جرأت سے اور کس قوت اور اعتماد سے کائنات کو پکارتا ہے:

اے زمیں! اے آسماں! اے زندگی! اے کائنات!
اے ہوا! اے موجِ دریا! اے نشاطِ بے ثبات!
اے پہاڑوں کی بلندی! اے سرودِ آبشار!
اے گھٹا جھومی ہوئی! اے نغمہ برلبِ جوئبار!

اور اسی طرح وہ کائنات کی ہر شے کو پکارتا ہے اور آخر میں کہتا ہے:

اے خمارِ بادۂ دولت میں بیہوش و حواس!
اے کہ تم سے ذرہ ذرہ زندگی کا ہے اداس!
بے نیازِ مستیٔ ہر جام و سبو کر دو مجھے
اپنے کیفِ مستقل سے اس طرح بھر دو مجھے
میں تمہارا بن کے سوز و جذب کا ماہر بنوں
دل سے وہ نغمے اٹھیں جن کے لیے شاعر بنوں

آخری شعر مجھے چونکا دیتا ہے کیونکہ اس نوخیز نوجوان نے کائنات کے حسن اور دولت کے نشے میں سرشار لوگوں کو، جن کے وجود سے دنیا اداس ہے، ایک ہی انداز سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ نہیں، شاید وہ بےخیالی میں کہہ گیا ہے:

میں تمہارا بن کے سوز و جذب کا ماہر بنوں

ورنہ ان دولت پرستوں کا نہیں ہو سکتا۔ بہرحال ابھی اس کی تصویر ادھوری ہے، خیال ناپختہ ہے، اور میں ورق گردانی کرتا ہوں:

مژدہ، اے دل! پھر گلستاں میں بہار آنے کو ہے
از سرِ نو لالہ و گل پر نکھار آنے کو ہے

انقلابی صُور پھونکا جا رہا ہے دھر میں
غمزدہ دل کو عشرتِ غم سازگار آنے کو ہے
چاندنی سوئی ہوئی ہے وادیٔ گلپوش میں
کوہ سے گاتا ہوا اک آبشار آنے کو ہے

جب شاعر یہ مژدہ سناتا ہے، تو نوجوان انقلابی کی تصویر ابھر آتی ہے۔
۱۹۳۶ء کی یہ نظم یاد دلاتی ہے کہ اسی سال ہندستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی تھی اور اس سے شاعری کی تصویر کا دھندلا سا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ اگرچہ وہ ترقی پسند مصنفین کا رکن نہیں، مگر عین جوانی میں اس تحریک کی روح سے اپنے ذہن کو بچانا بھی اس کے لیے ممکن نہیں۔

پھر کہیں بہار، کہیں بسنت، کہیں کہسار، کہیں ابرِ بہار کی منظر کشی، کبھی مطربہ سے گفتگو، کبھی کسی کی شوخ تصویر سے باتیں، کہیں وہ اپنی تلاش میں آئینے کے سامنے جلوہ گر نظر آتا ہے۔ کہیں کسی مغرور کو نہایت شوخی اور بانکپن سے دعوتِ نظر دیتا ہے:

سحر کے آفتاب کی طرف تو دیکھتی ہو تم
لطافتِ گلاب کی طرف تو دیکھتی ہو تم
حیاتِ کامیاب کی طرف تو دیکھتی ہو تم

میری طرف بھی دیکھ لو

مگر میں یہ رنگِ سخن دیکھ کر مطمئن نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان شعروں میں مجھے شاعر کی وہ سچی تصویر نہیں ملی، جس کے خدوخال کی تلاش میں، میں نے اپنا ذہنی سفر شروع کیا ہے۔ ہاں، شاعر کے ذہن کا ایک ہلکا سا پرتو ان اشعار میں ملتا ہے، جب وہ اپنے محبوب شاعر کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

وہ عندلیبِ خزاں درنگاہ ہے شاعر — فضا بہار کے نغموں سے جس کی ہے معمور
دہن میں جس کے زبانِ کلیم ہے گویا — ہے جس کے سینے میں روشن چراغِ محفلِ طور

اور

مثالِ بانگِ درا رازدارِ منزل ہے
ہے ایک ذرّۂ پامالِ منزل اس کے حضور
اسی کے گیت کا طاری ہے مجھ پہ کیف و سرور
اسی کے گیت میں پنہاں ہے ہستیِ جمہور

یہ اشعار پڑھنے کے بعد یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ ضیا فتح آبادی اقبال کے مدح خواں ہیں۔ اور ان کے ذہن کی تصویر کا ایک رنگ واضح طور پر نظر آنے لگتا ہے۔ اقبال ہی کے انداز میں وہ خدا کے مختلف مظاہر سے ہمکلام ہونے کی کوشش کرتے ہیں:

کلی سے یوں کہا بادِ سحر نے — تجھے پالا ہے آغوشِ قمر نے

یا

اے گل، نو واردِ اقلیمِ حسن — سوز کی لذّت سے تو واقف نہیں
مست تو اپنے ہی رنگ و بو سے ہے — حسن کی فطرت سے تو واقف نہیں

خود ہی ساقی، خود ہی میخانہ ہے تو
خود ہی بادہ، خود ہی پیمانہ ہے تو

گلِ نو شگفتہ سے یوں ہمکلام ہوتے ہیں:

تو ہے اک جامِ شگفتہ چشمِ ظاہر کے لیے — اور ابہامِ مجسم قلبِ شاعر کے لیے

یا

ستارہ صبح کا بامِ فلک پہ جب چمکا — تو ہمکلام ہوا اس سے قطرہ شبنم کا
کہ تو پیامِ اجل بہرِ ہستیِ شب ہے — تری نمود سے لرزاں وجودِ کوکب ہے

یہ مطالعہ اس شاعر کے ذہن کے خوبصورت عکس پیش کرتا ہے جس کی تصویر کی مجھے تلاش ہے۔ میں ایک گونہ مطمئن ہو کر اس نوجوان شاعر سے بہت سی امیدیں وابستہ کرتا ہوں، جو یہ بلند آہنگ نظمیں کہتے وقت چوبیس سال سے زیادہ کا نہیں

کیونکہ "نورِ مشرق" ۱۹۳۷ء میں طبع ہوئی اور ضیا صاحب ۱۹۱۳ء میں عالمِ وجود میں آئے۔ اس مجموعے کی بعض نظمیں تو ۱۹۳۰ء کی تخلیق ہیں۔

میری امیدیں اور مستحکم ہو جاتی ہیں، جب میں "نورِ مشرق" کے دیباچے میں جوش ملیح آبادی کے یہ الفاظ دیکھتا ہوں: "ان کا کلام غزل گوئی کی غیر فطری مسخرگی سے قطعاً پاک ہے۔" اور ہر وہ شخص جس کا دماغ اس سے زیادہ سن رسیدہ ہو، قابلِ محبت و عقیدت ہوا کرتا ہے۔

اور حکیم آزاد انصاری کا قلم "نورِ مشرق" کی تعریف میں یہ جملہ لکھتا ہے: "اور اس کی اکثر نظمیں بلند تر نظمیں کہلانے کی مستحق ہیں"

لیکن ضیا فتح آبادی کی شاعرانہ شخصیت کی تصویر کے جو خد وخال "نورِ مشرق" کی ضیا پاشیوں سے اجاگر ہوتے ہیں، وہ دقت کے دھندلکے میں گم ہوتے محسوس ہوتے ہیں، یہاں تک کہ "نئی صبح"، بھی "نورِ مشرق" کی گرد کو نہیں چھو سکی۔ "نئی صبح" کی تاریخ اشاعت درج نہیں، لیکن مبشر علی صدیقی کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۵۰ء کے بعد کی ہے کیونکہ مبشر علی صدیقی نے فروری ۱۹۵۰ء میں شاعر کے سالنامے میں ضیا صاحب کی ایک نظم فنکار دیکھ کر اعجاز صدیقی سے پوچھا ہے کہ یہ ضیا فتح آبادی کون ہیں؟ اور اعجاز صاحب جواب دیتے ہیں کہ وہ سیماب اسکول کے معزز رکن ہیں۔ اور میں ان انکشافات کو عبرتناک سمجھتا ہوں۔ اول، اس لیے کہ "نورِ مشرق" کا شاعر اس قدر جلدی بھلا دیا گیا، تو کیوں؟ دوسرے، اس لیے کہ "نورِ مشرق"، کی اشاعت کے وقت بھی ضیا صاحب، سیماب اسکول کے رکن تھے! "نورِ مشرق" میں سیماب مرحوم کے بیٹے منظر صدیقی کا مضمون بھی شامل ہے اور یا بھی خط و کتابت کی تاریخ ۱۹۲۹ء لکھی ہے، جب ضیا صرف ۱۶ سال کے ہوں گے، اور سیماب اسکول کے اس رکن کا ۱۹۳۷ء میں قابلِ رشک عروج دیکھیے، اور پھر ۱۹۵۰ء یا اس کے بعد کی مطبوعہ "نئی صبح" کی نظمیں۔ ان میں نہ وہ پروازِ خیال ہے، نہ وہ آہنگ، نہ وہ سوز اور جذبِ دروں۔

بہت جا چکی ہے شبِ تیرہ ساماں — اجالوں کے سایے افق پر ہیں رقصاں
وہ تارا، یہی تو ہے تارا سحر کا — یقیناً نہیں اس میں دھوکا نظر کا
نہیں دور، اب تو نظر آ رہی ہے — اٹھو دوستو! وہ سحر آ رہی ہے

میں "نورِ مشرق" کی نظموں کے بعد ضیا صاحب سے ان اشعار کی بہ نسبت زیادہ رواں دواں اشعار کی توقع کرتا ہوں۔ یا یہ شعر

تدبیر کے ہاتھوں، انساں کی تقدیر بدلنے والی ہے
فنکار بدلنے والا ہے، تصویر بدلنے والی ہے
ذہنوں نے نئی انگڑائی لی، زنجیرِ جہالت ٹوٹ گئی
لکھنے پڑھنے والوں کی قسم، تحریر بدلنے والی ہے

"نئی صبح" کی نظمیں پڑھ کر مجھے اس تصویر کے لیے اور رنگ نہیں ملتے، جس کے خد و خال ضیا صاحب کی ابتدائی نظموں میں نظر آتے تھے۔ "نئی صبح" میں بقولِ جوش "غزل کی مسخرگی" بھی موجود ہے۔ میں غزل کو مسخرگی نہیں سمجھتا۔ اقبال کے یہاں کامیاب غزل کے نمونے موجود ہیں، اور ان کے مخصوص رنگ و آہنگ ہی کا ہیں

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا!
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا!

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر — ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں۔
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا، مہِ کامل نہ بن جائے

اسی طرح غزل کو مسخرگی کہنے والے شاعر جوش کے یہاں بھی ان کے رنگ و آہنگ کی غزلیں موجود ہیں:

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

یہی تو ہیں وہ ستونِ محکم، انھیں پہ قائم ہے نظمِ عالم
یہی تو ہے رازِ خلدِ آدم، نگاہ میری، شباب تیرا

سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا   جا، تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

ضیا فتح آبادی نے اپنی نظم "انقلابِ بہار" میں بھرپور اشعار کہے ہیں:

غرق مے ہونے کو ہے پھر عالمِ امکاں تمام
ساقیِ مخمور سوئے جوئبار آنے کو ہے
گونجتے ہیں سازِ پیمانہ پہ نغماتِ شراب
میکدے کی سمت پھر پرہیزگار آنے کو ہے
پھر نظر کے سامنے ہے جلوہ زارِ روئے دوست
روح کو آرام اور دل کو قرار آنے کو ہے

نظم میں ایسے رواں دواں اور شعریت سے بھرپور اشعار کہنے والا شاعر جب غزل کی وادی میں پہنچتا ہے، تو اس کا رنگ و آہنگ کس قدر بدل جاتا ہے:

انتظارِ دوست کا غم، کھائیں کیا!   ہم فریبِ آرزو میں آئیں کیا!
چٹکیاں لیتی ہے دل میں یادِ یار   اشک اپنی آنکھ میں بھر لائیں کیا!
دن وہی ہیں، اور راتیں بھی وہی   ہم دلِ مایوس کو بہلائیں کیا!
تم چلے آئے تو ساری بیکلی جاتی رہی   زندگی میں تھی جو یک گونہ کمی جاتی رہی

ان سے ہم اور ہم سے وہ، کچھ اس طرح گھل مل گئے
وہ ملاقاتوں میں سب بیگانگی جاتی رہی

ضیا فتح آبادی کی بیشتر غزلوں میں مجھے اس تصویر کے خدوخال نہیں ملتے جس کی تلاش میں، میں نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔

مجموعی طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ "نئی صبح" ضیا فتح آبادی کا ایک دھندلا سا نقش پا ہے اور اس امر کا ثبوت کہ انھوں نے تمام عمر عہدِ وفا نبھایا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی محبوبۂ سخن سے کہہ رہے ہیں:

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

لیکن میں ابھی نہیں تھکا ہوں اور اس تصویر کی تلاش میں ہوں، جس کے خدوخال کہیں نہ کہیں ضیا کی نظموں میں ضرور ملینگے۔

"نورِ مشرق" کی وادی سے نکل کر اور "نئی صبح" سے کسی قدر مایوس ہو کر میں اس تصویر کی تلاش میں پھر سرگرداں ہوں۔

آزادی کے بعد زندگی کی رفتار بدلی۔ اس کی اقدار بدلیں۔ اور غیر محسوس طور پر فکر و نظر کے پیمانے بھی بدل گئے۔ زندگی گاؤں اور قصبوں سے نکل کر شہروں اور کھیتوں سے نکل کر ملوں اور کارخانوں میں آگئی۔ پُرسکون شاموں کی خوش گپیوں کو مشینی دور کے ہنگاموں نے نگل لیا۔ پھر کہاں الفاظ کے نگینے تراشنے کا ہوش اور کہاں کا محفل آرائی کا یارا! اب تو شہری زندگی کی آڑی ترچھی لکیریں ہیں۔ بیربط لفظوں اور بے ردیف وقافیہ معریٰ نظموں ہی میں زندگی کی تصویر نظر آجائے، تو غنیمت جانیے۔

اور اب مجھے آہستہ آہستہ ضیا کی نئی تصویر کے خدوخال نظر آنے لگے ہیں:

یہ رسوم اور روایات کی زنجیر و قیود
نام والوں کی یہ بیکار سی اک فکرِ نمود
وسعتِ عشق ہے اس دور میں کتنی محدود!

اس دور میں وسعتِ عشق محدود ہے۔ مگر زندگی کے مسائل لامحدود ہیں اور ضیا کی پریشان حال تصویر اپنی ترچھی لکیروں سے تشکیل پا رہی ہے؛ زندگی نے اسے بے خانماں کر دیا ہے:

اے دیارِ حسن شہرِ آرزو دلّی اسلام — تیری گلیاں چھوڑ کر سوئے دکن جاتا ہوں میں

رہگزارِ زندگی میں آگیا ہے وہ مقام — اک مسرت کھو رہا ہوں، اک خوشی پاتا ہوں میں

اور وہ دکن جا کر مدراس کے سمندر کی لہروں سے الجھنے لگتا ہے! اور ان طوفان خیز ہواؤں سے اس کے اندر کا سویا ہوا شاعر جاگ اٹھتا ہے۔ کرب زندگی کی کتنی

خوبصورت تصویر ہے:

چلا آیا ہوں میں مدراس قسمت کے اشارے پہ
کھڑا ہوں ایک طوفانی سمندر کے کنارے پہ
یہ ہیبتناک عظمت آب کی، دیکھی نہیں جاتی
مسلسل کشمکش میں زندگی دیکھی نہیں جاتی
ہواؤں سے سمندر کی رگیں کھنچتی مچلتی ہیں
فلک کو چھو ہی لینگی اس طرح موجیں اچھلتی ہیں

ہماری اور آپ کی طرح ضیا بھی اس بے ہنگم ہجوم میں ایک گمشدہ سا انسان ہے۔ یہ گمشدگی روایتی نہیں، بلکہ نئی زندگی کی تلخیوں کی سوغات ہے:

سورج کی پہلی ہی کرن نے سارا افسوں توڑ دیا ہے
دن کے ہنگاموں کی لگن میں انساں خود کو بھول گیا ہے

اب وہ عرفانِ ذات کی سرحدوں میں داخل ہوتا جارہا ہے اور اپنے وجود کو آوازوں کے شہر میں تلاش کرتا ہے۔ وہ تو آوازوں کے گنگ شہر سے ڈرتا ہے۔ مگر میرے ذہنی سفر کے لیے یہ شہر نشانِ منزل ہے اس شاعر کی تصویر کے کئی رنگ مجھے یہاں نظر آتے ہیں:

آوازوں کا شہر

ساز ٹوٹے ہوئے مطرب خاموش
گیت مقتول، تو نغمے بسمل
ٹھمریاں بیٹھی ہیں سر لٹکائے
پائلیں بے حس و حرکت، مظلوم
نقابِ پائین طبلہ وجودِ بیسود
قلقلِ مینا کہیں کھوئی ہوئی
گم فضاؤں میں کھنک جاموں کی۔

نہیں کلیوں کے چٹکنے کی صدا
بلبلیں مہر بلب، محوِ سکوت
چلتی ہے ڈرتی، دبے پاؤں نسیم
کسی مسجد سے نہیں اٹھتی اذاں
شورِ ناقوس بھی مندر میں نہیں
سیٹیاں، ہارن، بگل چپ سادھے
موٹریں چلنے کی آواز نہیں
حادثے، فتنے، سرافراز نہیں
اور کیا ہے، یہ اگر راز نہیں؟
کوئی بولے، تو میں اس سے پوچھوں
کیا یہی شہر ہے آوازوں کا
مجھے لے آئی ہے تنہائی کہاں!
ایک سناٹا ہے طاری ہر سُو
میری آواز ڈراتی ہے مجھے
گھر کیوں بند پڑے ہیں کب سے
اپنا بیگانہ یہاں کوئی نہیں

کیوں نہ اب خود ہی پکاروں خود کو!
کوئی آواز تو کانوں میں پڑے
یہ مرا شہر ہے آوازوں کا۔

ضیا! نئی نظموں کی سیر کرتے کرتے کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود ایک بوڑھا سورج ہے۔ اور اس احساس کو بھی اس کی تصویر میں سجا لیتا ہوں۔ یوں رفتہ رفتہ تصویر مکمل ہوتی جا رہی ہے:

خلشِ وقت

وقت کی لمبی، ختم نہ ہونے والی ڈگر پہ
چلتے چلتے، کھویا کھویا
کرنوں کے روشن گھوڑے پر بیٹھا،
بوڑھا سورج سوچ رہا ہے،
دیکھ رہا ہے
کل کا قطرہ آج ہے دریا
صحرا کا ہر ذرّہ ذرّہ
جوشِ نمو سے تنگیِ داماں کا شاکی ہے!
پھیل کے، بڑھ کر کوہِ گراں بنتا جاتا ہے
اور یہ بوڑھا سورج کب تک اپنی آگ میں جلتا رہیگا
کب تک ننھے دمکتے تارے اس کی پوجا کرتے رہینگے
کب تک خود سورج نہ بنینگے
بوڑھا سورج سوچ رہا ہے

"بوڑھا سورج" ضیا کی تجربہ کار زندگی کی خوبصورت تصویر کا پُر وقار نام ہے۔
جب اس نے اس سورج کے گردِ عمر کے ساٹھ جگمگاتے ستارے سجائے، تو
یہ خوبصورت نظم تخلیق کی:

جگمگ جگمگ ساٹھ ستارے
توڑ کے گردوں کی ٹہنی سے۔
میں نے سجائے
آنگن کی دیوار پہ اپنی
طاق کی زینت ساٹھ دیے ہیں۔

یہ نظم اس یقین کے ساتھ ختم ہوتی ہے:

مجھ کو ابھی زندہ رہنا ہے۔

اپنی ساٹھویں سالگرہ پر اس قدر پُر زور نظم آج کے پُر آشوب دور میں وہی کہہ سکتا ہے، جس کا دل غنی ہو، اور جسے سکون اور اطمینان میسر ہو، پُر وقار چمکدار، بوڑھے سورج کی طرح۔ بوڑھے سورج کے سینے میں ضیا کا ایسا دل دھڑکتا ہے، جب وہ سوچتا ہے:

کب تک ننھے دمکتے تارے
اس کی پوجا کرتے رہینگے!
کب تک خود سورج نہ بنینگے!

تو اس کی آواز جوان ہو جاتی ہے، اور اس کی آنکھ کا تارا سچ مچ سورج بن جاتا ہے اور ضیا سے شادی جیسی خوبصورت نظم کہلواتا ہے، وہ نظم جس سے اس تصویر کی تکمیل ہوتی ہے، جس کی تلاش میں، میں نے اپنا ذہنی سفر شروع کیا تھا:

اپنے آنگن میں جو لگایا تھا — ایک پودا گلاب کا میں نے
بیس اور نو برس میں وہ بڑھ کر — میرے قد کے قریب آ پہنچا
روشنی گھر کے گوشے گوشے میں — اس کے حسن و جمال کی پھیلی
لے اڑی نکہت اس کی بادِ بہار — اور معطر ہوا تمام چمن
رکھ دیا زندگی کا نام چمن

تنویر احمد علوی

ضیا صاحب — ایک تاثر

ضیا فتح آبادی سے میں براہِ راست ابھی چند سال پیشتر متعارف ہوا، جب شبیش چندر طالب دہلوی مرحوم کے یہاں ایک ادبی محفل میں ان سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام ذہن کے کسی گوشے میں پہلے سے محفوظ تھا اور یہ خیال بھی کہ وہ ایک اچھے شاعر ہیں، اور سیماب مرحوم کے دبستانِ فکر سے وابستہ ہیں۔

جب ان سے ایک دو بار ملنے کا اتفاق ہوا اور بات چیت کا موقع ملا، تو معلوم ہوا کہ وہ بہت سنجیدہ اور بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی ہیں، رفتار و گفتار میں ایک خاص سلیقہ برتتے ہیں، اور خوش ذوقی ان کے ذہن اور زندگی کا جزوِ لاینفک ہے۔ ان کے لہجے میں ہلکی سی پنجابیت ضرور ہے اور بعض الفاظ کا تلفظ بھی وہ پنجابی انداز سے کرتے ہیں، مگر بحیثیتِ مجموعی بالکل نستعلیق آدمی ہیں اور زبان کی صحت کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ اردو سے انھیں غیر معمولی تعلقِ خاطر ہے اور کئی اعتبار سے اردو زبان ہی ان کا مزاجِ زندگی بن گئی ہے۔ اردو سے ان کا ذہنی رشتہ اور تہذیبی تعلق ایک اہم ادبی روایت کے تاریخی تسلسل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پچھلی ایک صدی میں، اردو زبان و ادب کے فروغ میں سرزمینِ پنجاب نے بیحد اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو کے شاعروں، ادیبوں، نقادوں اور محققوں

بیں وہ نام بہت ممتاز ہیں، جو پنجاب کے مردم خیز خطے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں ملک کے مختلف علاقوں اور مرکزی شہروں نے اس زبان کی ترقی و توسیع میں حصہ لیا ہے۔ اس میں پچھلی صدی کے ربع آخر سے لے کر موجودہ صدی کے ربع ثالث تک دلی اور لکھنؤ جیسے ادبی مرکزوں سے کچھ زیادہ ہی پنجاب بالخصوص شہر لاہور کا حصہ رہا ہے جس نے اردو خدمات کے سلسلے میں ایک بڑے مرکزی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ اہل پنجاب کی طرف سے علمی و ادبی خدمات کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور اس سلسلۃ الذہب سے بہت سی اہم علمی اور ادبی شخصیتیں وابستہ ہیں۔

ملک کی تقسیم کے بعد ہندستان میں لسانی ریاستیں وجود میں آئیں۔ اس سے مختلف لسانی گروہوں کی تقسیم اور واضح صورت میں سامنے آگئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا زبان کے ساتھ ذہن بھی بٹ گئے ہیں۔ پنجاب جس کے سر سے بٹوارے کی موجِ خون گزری ہے، وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر بھی اہل پنجاب نے اپنے ادبی رشتوں اور تہذیبی روابط کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ پنجاب میں ہنوز ذولسانیت کا رجحان موجود ہے، اور یہ اس کے تہذیبی خمیر اور لسانی شعور کا حصہ ہے۔

پنجاب کے لوگ اپنے گھروں میں اور آپس کی بات چیت میں بجا طور پر اپنی مادری زبان ہی کو وسیلۂ اظہار بناتے ہیں؛ لیکن تہذیب و ادب سے ان کا لگاؤ اور وسعت، تمدنی دائرے سے وابستگی کے باعث وہ اس چھوٹی وفاداری کو بڑی وفاداری میں بدل دینے پر ہمیشہ آمادہ رہتے ہیں۔ ہندستان کی دوسری سرحدی ریاستوں کے مقابلے میں پنجاب کا مزاج یہ ہے کہ وہ پھیلاؤ چاہتا ہے؛ سکڑنا اور اپنی علاقائی حیثیت میں مگن رہنا اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ اسی لیے دوسری زبانوں سے اپنے ادبی اور تہذیبی تعلق کے معاملے میں پنجاب کے لوگ کچھ زیادہ لچکدار ذہن رکھتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد پنجاب والوں نے آکر دہلی کو آباد کیا۔ آج اس کی نئی کالونیاں دراصل پنجابی بولنے والے لوگوں کی آبادیاں ہیں۔ اہلِ پنجاب نے اپنی تعداد اور قوتِ عمل سے دتی کے انتظامی، سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے کے ساتھ یہاں کی لسانی، ادبی اور تہذیبی فضا پر بھی اثر ڈالا ہے جس کے نتائج اس عظیم شہر کے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔

دتی میں اردو کی ساکھ بڑی حد تک ان اہلِ پنجاب کی وجہ سے دوبارہ قائم ہوئی اور وہ خلا پُر ہوا، جو دتی کے مسلمان ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں کے ترکِ وطن سے پیدا ہو گیا تھا۔

ضیا صاحب کے ذکرِ خیر میں یہ جملۂ معترضہ کچھ زیادہ طویل ہو گیا، لیکن اس کے بغیر خدمتِ ادب کی اس شعوری کوشش اور لسانی رویہ کو پوری طرح سمجھنا مشکل ہو گا، جس کے نمایندے ضیا صاحب ہیں۔ ضیا صاحب کی شاعری ایک تازہ تر روایت کے تسلسل کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس کی گہرائیوں کا احساس دلاتی ہے۔ وہ ان متعدد شاعروں، زباندانوں اور فن سے وابستگی رکھنے والوں کے ایک ممتاز نمایندے ہیں، جو آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد ستایش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر پُرخلوص اور خاموش طریقے سے اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر آدمی کا ایک انفرادی دائرہ ہوتا ہے، جس کی حدود میں رہتے ہوئے وہ کوئی کام یا کارنامہ سرانجام دیتا ہے۔

وہ لوگ بھی قابلِ قدر ہیں، جو ادب یا فن کی خدمت سے پیشہ ورانہ حیثیت میں وابستہ ہیں اور اپنے متعلقہ کام کو نہایت نیک دلی سے انجام دیتے ہیں۔ لیکن ان سے کچھ زیادہ ہی وجہِ اعتبار ان لوگوں کا خلوص فکر ہے، جو محض تہذیبی رشتوں کی استواری اور فن کی قدر شناسی کے طور پر اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار خدمتِ لوح و قلم کی صورت میں کرتے ہیں اور اس کا سب سے بڑا محرک وہ تہذیبی شعور ہوتا ہے جو ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارتا اور انھیں زبان و ادب کی خدمت پر

آمادہ کرتا ہے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس تخلیقی جوہر کی فطری طور پر موجودگی اور اس کی مخلصانہ تربیت ان لوازمات میں سے ہے جن کے بغیر یہ مرحلۂ شوق طے نہیں ہوتا۔

ضیا صاحب اب اپنی عمر کی ۶۵ ویں منزل میں ہیں، اور ذوقِ شعر گوئی تقریباً نصف صدی سے ان کا شریکِ سفر ہے۔ ان کے بیان کے مطابق ان کی پیدائش ۹ فروری ۱۹۱۳ء کو صبح کے وقت ہوئی، نام مہر دین رکھا گیا، جو بعد میں مہر لال ہوگیا۔ مہر کے معنی سورج کے بھی ہیں اور محبت کے بھی ضیا صاحب کی شخصیت میں ان دونوں معانی کا پرتو موجود ہے۔ ضیا تخلص بھی اسی معنوی مناسبت کی طرف اشارہ کر رہا ہے، اسے حُسنِ اتفاق بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

ان کے خاندان میں دور دور تک ذوقِ شعری کا پتا نہیں ملتا۔ یہ ضروری بھی نہیں کہ کوئی شخص خاندانی طور پر شاعر ہو۔ لیکن ان کی تربیت جس ماحول میں ہوئی، اس میں وہ مخفی اثرات موجود تھے، جنھوں نے ان کے شعورِ شعری کو متاثر کیا۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

> یہ بھی حقیقت ہے کہ میرے ذوقِ شعر کی تربیت و پرورش میں میری والدہ شنکر دیوی کی حساس طبعی اور نرم دلی کا بہت زیادہ دخل ہے۔

ضیا صاحب کے دل کی گرمی، ان کے لہجے کی نرمی اور ان کے گداز طبیعت میں جو ان کی حسیاتِ شعری کا حصہ ہیں۔ ان کی والدہ کی حساس طبعی اور نرم دلی کا عنصر مرئی اور غیر مرئی طور پر شریک نظر آتا ہے۔ مزید برآں ان کے والد کو موسیقی سے گہرا تعلق تھا۔ شاعری اور راگ وِدّیا میں جو قریبی رشتہ ہے اس کا اثر بھی ضیا صاحب کے فنی شعور نے کم و بیش قبول کیا ہے۔

ان کے والد لالہ منشی رام سونی نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنے زمانۂ تعلیم میں شعر گوئی سے دلچسپی لیں اور اس طرح اپنا قیمتی وقت ضائع کریں۔ لیکن طبیعت

کے فطری تقاضوں کو کون قابو میں رکھ سکا ہے! چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ضیا صاحب نوعمری میں شعر کہنے لگے تھے۔ مگر انھوں نے شعر گوئی سے فطری لگاؤ اور اس کی طرف اپنی طبیعت کے قدرتی میلان کے باوصف اپنے سلسلۂ تعلیم کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ موزونیتِ طبع کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں "توازن" کا عنصر بھی فطری طور پر موجود ہے جس کی وجہ سے انھوں نے ایک کے لیے دوسرے کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہی توازن ان کے یہاں ماضی و موجود اور قدیم و جدید کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے اور اسے خوبصورتی سے نباہنے کی کوشش میں ملتا ہے۔

ان کی سیرت و سوانح کے مطالعے میں اس پہلو کو بھی شاید نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ ایسے مختلف مقامات سے وابستہ رہا، جو اپنے اپنے دائرے میں ایک تہذیب اور ایک تاریخ کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان سب کو اگر ایک نظر میں دیکھا اور ایک بڑے دائرے میں مرتکز کیا جاسکے تو یہ قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح ایک دوسرے سے ملتے اور الگ ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ملازمت کے سلسلے میں والد کو مختلف مقامات پر جانا پڑا، اور ہم سب ان کے ہم رکاب رہے۔ بچپن سابق ریاست الور (راجستھان) میں گزرا۔ جب میری تعلیم کا آغاز ہوا، تو ہم پشاور پہنچ چکے تھے۔ پشاور چھاؤنی کے خالصہ مڈل اسکول میں دو تین سال پڑھنے کے بعد ہم جیپور (راجستھان) پہنچ گئے۔ یہاں مہاراجا ہائی اسکول سے میں نے ۱۹۲۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۱ء میں ہندو سبھا کالج، امرتسر سے ایف اے کا امتحان پاس کرکے، میں فورمین کرسچین کالج، لاہور میں داخل

ہوگیا، جہاں سے میں نے ۱۹۳۳ء میں بی اے آنرز فارسی میں اور ۱۹۳۵ء میں ایم اے (انگریزی) کے امتحان پاس کیے۔

ان مرکزوں میں ایک طرف لاہور اور امرتسر ہیں، تو دوسری طرف الور اور جے پور؛ اور ان سے مختلف پشاور۔ ہندستان کے تہذیبی جغرافیہ کی یہ رنگا رنگی ان کے فکر اور فن پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ ضیا صاحب کا شعری مزاج بھی اس دلآویز حقیقت کے خوش آیند اثرات سے کیسے الگ رہ سکتا تھا! انھوں نے فارسی آنرز کے ساتھ انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا؛ اس نے ان کے ذہن اور زندگی میں مشرق اور مغرب کا ایک حسین امتزاج پیدا کر دیا۔

اسی کے ساتھ وہ ایک سے زیادہ اساتذہ کے حلقۂ سخن سے وابستہ رہے ہیں۔ یہ وابستگی سچ پوچھیے، تو ان کے تلونِ طبع کی نہیں، اس مضطرب اور متجسس مزاج کی آینہ دار ہے جس کے لیے حالی نے کہا تھا:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!

اپنے مختلف اساتذۂ سخن کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے۔

"شعر سے فطری رغبت بچپن ہی میں محسوس ہوئی۔ جب مجھے علم ہوا کہ اصغر علی صاحب جو مجھے گھر پر اردو پڑھانے آتے تھے، شعر بھی کہتے تھے اور حیا تخلّص کرتے تھے، تو میں نے شعر کہنا انھیں سے سیکھا اور انھوں نے مجھے عطا تخلّص عطا کیا۔ امرتسر منتقل ہو جانے پر میں جناب فرخ امرتسری کا باقاعدہ شاگرد بن گیا اور انھوں نے میرا تخلّص بدل کر ضیا رکھ دیا اور آج تک مجھے دنیائے شعر اسی نام سے جانتی ہے۔ اسی زمانے میں چند غزلیں جناب نیرؔ ظفرانی صاحب کو بھی دکھائیں۔ اتفاق سے شاعر آگرہ کا ایک پرچہ میری نظر سے گزرا، اور ۱۹۳۰ء میں خط کے ذریعے میں اس کے مدیر اعلیٰ علامہ سیماب اکبر آبادی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گیا۔ مجھے

علامہ مرحوم کے قدموں میں رہنے کی سعادت نہیں ملی اور سلسلۂ اصلاح بذریعۂ ڈاک، جاری رہا، جو فارغ الاصلاح کر دیے جانے کے بعد بھی ان کی وفات تک نہیں ٹوٹا۔ یہ علامہ مرحوم کا مجھ پر خاص کرم تھا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ضیا صاحب کو اپنے اساتذہ سے کس قدر عقیدت اور محبت رہی ہے اور آج تک ہے۔ حسرت نے اپنے بارے میں کہا تھا:

طبعِ حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

اس کا اطلاق ضیا صاحب پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن وہ اپنے فکری اور فطری رجحان کے تحت جس صاحبِ کمال سے عمر بھر اپنے کلام پر اصلاح لیتے رہے، وہ علامہ سیماب اکبر آبادی ہی ہیں، جو خود اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے۔ علامہ سیماب کا کافی گہرا اثر ضیا صاحب کے ذہن، زبان اور زندگی پر ہے۔ ان کے یہاں شروع سے اخیر تک جو نستعلیق انداز ہے، اس میں ان کی اپنی سلامت روی اور توازن پسندی کے ساتھ اس سلسلۂ تربیت اور دائرۂ فکر و فن کو بھی بہت دخل ہے، جس سے وہ وابستہ رہے ہیں، اور آج بھی یہ رشتہ اسی طرح قائم ہے۔ دلّی میں ضیا صاحب کی قائم کردہ، بزمِ سیماب کے زیرِ انتظام ادبی اور شعری نشستیں ہوتی رہتی ہیں۔ ضیا صاحب نے اپنے استاد کی یاد میں بڑے شاندار مشاعرے بھی کیے ہیں۔

مشاعرے کا تربیتِ اہلِ سخن اور احساسِ تکمیلِ فن سے جو تاریخی رشتہ ہے ضیا صاحب نے کبھی اسے نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ علامہ سیماب بھی شاعری میں فنی اقدار کے احترام کو ضروری سمجھتے تھے، بلکہ اس پر زور دیتے تھے، ان کا سلسلۂ اصلاح اسی وجہ سے جاری تھا، اور ان کی زندگی تک جاری رہا۔ سیماب صاحب زبان کی صحت پر جو دھیان دیتے تھے، اس کے معنی خود ان کی شاعری میں یہ نہیں تھے کہ وہ شعر کو ہر نوع کے روایتی حدود کا پابند رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے شاعری میں گوناگوں تجربے بھی کیے ہیں اور اچھے تجربے کیے ہیں جنھیں جذبے

کی صداقت سے خالی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ زبان کا رکھ رکھاؤ زیادہ مدنظر رکھنے کی وجہ سے ان کے یہاں زبانِ شعر میں معمولی انحراف اور جدت بھی ناپسندیدہ تھی۔ ضیا کے یہاں بھی معیارِ شعر گوئی یہی ہے۔ وہ شعر کی عیارگیری اور قدر شناسی میں کبھی زبان و بیان کو دوسرا درجہ دینے کو تیار نہیں ہوتے اور سچ تو یہ ہے کہ شعر کے آرٹ کو زبان کے آرٹ سے الگ کیسے کیا جا سکتا ہے!

ضیا کی شاعری کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں نظمیں بھی ہیں" اور بعض بڑی اچھی نظمیں، جن کے تخلیقی افکار پر کہیں کہیں اقبال کی چھاپ بھی نمایاں طور پر موجود ہے جیسا کہ کہا گیا ہے "اس وقت سبھی اقبال سے متاثر تھے" لیکن اپنی شعوری کوششوں میں ضیا اپنے استاد کی ڈگر سے نہیں ہٹے، انھیں ہٹنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ زبان کے معاملے میں اہلِ پنجاب کی عمومی روش یہ رہی ہے کہ وہ مستند طریقِ ترسیل اور معتبر روایت کی تقلید کو محکِ اعتبار سمجھتے ہیں۔ بالعموم وہ اہلِ ادب جو خود صاحبِ زبان نہیں ہوتے، یہی روش اختیار کرتے ہیں، اور لغت و قواعد اور اہلِ زبان کی اچھی اور اونچے درجے کی ادبی تخلیقات کو اپنا رہنما بناتے ہیں۔

آج پنجاب اور ملک کے بہت سے دوسرے علاقوں میں ایسے مراکز کی کمی ہے اور کہیں کہیں بالکل فقدان، جن سے وابستگی کے ساتھ اردو زبان کو سیکھا اور اس کی فکری اور فنی نزاکتوں کو سمجھا جا سکے۔ اب یہ کام ایسے ہی اشخاص و افراد کے ذریعہ سے ممکن ہے، جو اپنی ذات سے ایک انجمن بن سکیں، اور اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی بہ نگاہ تربیت اپنے حلقۂ سخن میں شامل کر سکیں۔ بزم سیماب کے وسیلے سے جس کی روح و رواں وہ خود ہیں، ضیا صاحب اردو زبان و ادب کی ایسی [illegible] انجام دے رہے ہیں۔ دلّی کی نئی بستیوں میں اردو کا فی الجملہ کوئی

چلن نہیں۔ قطع نظر اس سے کہ کچھ لوگ اس کے جاننے اور کچھ سمجھنے والے مل جائیں، ضیا صاحب کے قائم کردہ مشاعروں میں ایک دو بار جانے کا اتفاق ہوا تو پتا چلا کہ ان ادبی نشستوں کے ذریعے کس طرح اردو کا چرچا ہوتا ہے۔ ان محفلوں میں شریک ہونے والے کس طرح اردو کے لب و لہجہ، اس کے طرزِ سخن، اور شعری روایات سے واقف ہوتے ہیں اور اس کلچر سے شعوری یا نیم شعوری طور پر وابستگی اور ہم آہنگی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں، پچھلی چند صدیوں میں اردو جس کی ایک علامت بن کر ابھری ہے۔

ضیا صاحب کا شعورِ زیست اور سفرِ حیات جن مرحلوں اور منزلوں سے گزرا ہے، اس میں حزم واحتیاط اور نظم و ضبط کو ایک موثر و کارفرما ذہنی رویے کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں والہانہ طرزِ اظہار کی مثالیں نسبتاً کم ملتی ہیں۔ ان کے یہاں جذبہ تہ نشیں سمندر کی لہر کی طرح ابھرتا ہے، لیکن سطح پر اس کا تموج کبھی شور انگیز مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے جذبے کی تہ داریوں سے ہم آہنگ ہونا پڑتا ہے۔

ان کا انداز رومانیت کے مقابلے میں کلاسیکیت سے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں ایک نوع کی انتخابیت بھی ہے۔ وہ مختلف اساتذۂ سخن کی شعری زمینوں میں شعر کہتے ہیں؛ یہ مشاعروں کے لیے اختیار کی گئی زمین اور مصرع ہائے طرح پر کہی گئی غزلیں بھی ہو سکتی ہیں۔ ان میں ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ اسی رنگ و آہنگ میں شعر کہیں، جو خود صاحبِ طرح کا ہے۔ غالب کی زمینیں انھوں نے بار بار اختیار کی ہیں۔ مگر غالب کی قدر شناسی تو ممکن ہے، ان کے مزاجِ سخن سے مکمل ہم آہنگی رکھتی ہو، وہ اصغر و فانی سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ اصغر کی سنجیدگیِ ادا اور متانتِ فکر ان کا پسندیدہ ادبی معیار ہے۔ فانی سے انھوں نے احساسِ غم لیا ہے، مگر کبھی اس کی شدت میں نہیں ڈوبے،

بالخصوص مریضانہ غم پسندی سے وہ ارادی طور پر دور رہے ہیں۔
انھیں حالی کی دلسوزی بھی پسند آئی اور جذبۂ خدمت و اصلاح کی سرشاریاں بھی کچھ وقت کے لیے ان کے حصے میں آئیں مگر نہ وہ مصلح تھے، نہ مبلغ۔ اس راہ میں حالی کا ساتھ دیتے، تو کتنی دیر تک، اور کتنی دور تک! اسی کے ساتھ ان کے گیت، سانیٹ، قطعہ، رباعی، نظم اور غزل غرض کہ مختلف مروّج اصنافِ شعر کے نمونے اور بعض بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اس میں مشقِ سخن کو بھی دخل ہے اور عشقِ سخن کو بھی۔ وہ کبھی جذبات سے مجبور ہو کر شعر کہتے ہیں، تو بعض مواقع پر یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جذبہ ان پر طاری نہیں ہوا۔ بلکہ انھوں نے جذبے کو اپنے اوپر طاری کر لیا ہے۔ عمر بھر شاعری سے وابستگی کے ساتھ دھوپ چھاؤں کا یہ سلسلہ یوں ایک قدرتی مظہر کی حیثیت سے سامنے آنا بھی چاہیے۔ شاعری کا معاملہ بھی کچھ عجیب سا ہے، کبھی یہ شعر اچھا لگتا ہے کبھی وہ؛ کبھی زبان کا چٹخارا لطف دے جاتا ہے، تو کبھی کوئی خوبصورت تشبیہ اور معنی آفریں اشارہ ذہن کی سطح پر اپنی پرچھائیاں چھوڑ جاتا ہے؛ کہیں جذبے کی صداقت گہرے طور پر متاثر کرتی ہے، کہیں تجربے کی صحت، کہیں خیال کی گیرائی اور کہیں احساس کی شدت۔ یہی سبب ہے کہ ہر شخص کی شاعری سے اور ہر شعر سے ہمہ وقت لطف نہیں اٹھایا جاسکتا۔ قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد بھی ہوتا ہے، اور خود آفریدہ بھی۔
زبان کے معاملے میں وہ اساتذۂ قدیم کے پیرو ہیں، اور یہ بھی کلاسیکیت سے ان کی گہری دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ ان کے یہاں مشکل الفاظ بھی اچھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں، اور کہیں کہیں تو اس کے باعث ان کا لہجہ غزلیت کے دائرے سے نکل کر نظم کے شعری آہنگ سے قریب آجاتا ہے۔ ممکن ہے انھوں نے اس کے لیے اقبال کی غزلوں میں وجہِ جواز تلاش کی ہو۔ خود ان کے استاد سیماب اکبر آبادی کے یہاں بھی یہی کیفیت جگہ جگہ ملتی ہے
انھوں نے اپنے مختلف مجموعہ ہائے شعر کے سنینِ اشاعت دینے کا اہتمام تو کیا

ہی ہے ، مختلف شعری تخلیقات کے سنین اور وہ مقامات بھی درج کر دیے ہیں، جہاں ان کی شعری تشکیل عمل میں آئی۔ یہ بات بعض دوسرے اہلِ سخن کے مجموعوں میں بھی ملتی ہے اور تحقیقی و تنقیدی نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کا مجموعہ "دھوپ اور چاندنی" ان کے اپنے خوبصورت اور استادانہ خط میں سامنے آیا ہے۔ بحور و اوزان کے بعض استادانہ تجربے اور ردیف و قوافی کی فنکارانہ نشست کے دلچسپ نمونے ان کی غزلوں میں کبھی کبھی اور کہیں کہیں نظر آشنا ہوتے ہیں۔ تلاش کے عناصر سے بھی ان کا شعری مزاج بیگانہ نہیں ہے لیکن اس میں انھوں نے ہمیشہ توازن اور خوش آہنگی کو باقی رکھا ہے۔ جو شاعری میں ان کی ثقہ روش اور سلامت روی کی دلیل ہے۔

عشق و تصوف کی چاشنی سے ان کا کلام آشنا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو لیے دیے رہے اور کبھی دوسروں کو یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ان کے دل کے قریب کوئی برقِ بلا کوند رہی ہے حُسن میں ان کے لیے بے پناہ کشش ہے۔ لیکن ان کے لہجے کا دھیماپن اور لفظ و بیان کی سادگی ان کی خودی کو چیخنے نہیں دیتی۔ ایسے لمحوں ہی میں ان کی آواز اپنے اندر سمٹ جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم میر کی آواز سن رہے ہیں، مگر یہ آواز کہیں دور سے آ رہی ہے۔ ایک تربیت یافتہ ذوقِ سخن کے بغیر اس لہجہ میں شعر کہنا بھی مشکل ہے اور اس سے لطف اٹھانا بھی آسان نہیں۔

رگِ احساس میں نشتر ٹوٹا ہاتھ سے چھوٹ کے ساغر ٹوٹا
اشک پلکوں سے گرا یوں جیسے خشک ٹہنی سے گُلِ تر ٹوٹا

تھا مرا درد آشنا صحرا ہر قدم پر مجھے ملا صحرا
خود بخود ٹوٹتی ہے ہر زنجیر دے رہا ہے مجھے صدا صحرا
نظر آتا ہے اے ضیاؔ دیکھو دور سے کتنا دلربا صحرا

پیارا سنگھ

ضیا فتح آبادی کی شاعری میں حُب الوطنی

ہندستان میں تحریکِ آزادی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد شروع ہوئی تھی
حصولِ آزادی کے لیے مختلف انجمنوں نے اپنے تن، من، دھن کی قربانی دے کر
طوقِ غلامی اتار پھینکنے کے لیے بے حد جدوجہد کی۔ اس سلسلے میں فنکاروں نے
بھی اپنی نگارشات سے، تخلیقات سے، نغموں سے، ہندستان کی فضا میں
ایسی گونج پیدا کی جس سے غیر ملکی حکمرانوں کے کلیجے دہل گئے۔

جہاں ہندستان کی دوسری زبانوں میں اپنے وطن کی محبت کا ادب تخلیق ہوا،
اردو ادیب، فنکار، شاعر بھی اس سلسلے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ اردو
ادب کا نام لیتے ہی جن شاعروں کا نام زبان پر آتا ہے، ان میں جوش ملیح آبادی،
سرور جہان آبادی، سیماب اکبر آبادی، چکبست، اقبال اور مخدوم کے نام پیش
پیش ہیں۔ ان شاعروں نے جہاں شاعری کی دوسری صنفوں میں شعر کہے ہیں،
وہیں اپنے وطن کے نغمے بھی اتنے پیار سے، اتنی عقیدت سے، اتنے جوش سے
گائے ہیں کہ پڑھنے والوں کے دل جھوم جھوم جاتے ہیں۔ وہ اقبال کے لفظوں میں
خاکِ وطن کے ہر ذرّے کو دیوتا اور ہندستان کی مکتی پریت میں سمجھتے ہیں؛
وہ اہلِ چمن کو بار بار متنبہ کرتے ہیں کہ اگر وہ نہیں سمجھے تو مٹ جائینگے۔ زندگی

تگ و دو میں ہے، دوڑنے میں اور بیداری میں ہے۔ یہ احساس صرف حب الوطنی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ یہی جذبہ قوموں کی زندگی بدلنے کے لیے سب سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ بیشک ہندستان میں مختلف فرقوں کے لوگ بستے ہیں، مختلف مذاہب کے ماننے والے ہیں۔ لیکن راہِ نجات صرف اسی بات میں مضمر ہے کہ ان میں اتحاد ہو، یکجہتی ہو، باہمی رواداری قائم رہے۔ اس سلسلے میں ضیا فتح آبادی کی کوششیں بھی کسی سے کم نہیں

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا　　ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا
سب کعبوں سے بڑا کعبۂ وطن ہے۔

ضیا کو اپنے وطن کی ہر چیز سے محبت ہے۔ اس کے موسم ہوں کہ پھول بوٹے، اس کے شہر ہوں کہ مسجد و مندر، اس کے　ہوں کہ ادیب، وہ ان سب سے متاثر ہو کر انھوں نے شعر کہے ہیں۔ انھیں اپنے وطن کی مٹی سے بیحد پیار ہے۔ وہ اپنے وطن کو خراب آباد نہیں کہتے۔ اپنے وطن سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

وقت ہے، اب بھی سنبھل، اے کاروانِ منتشر
حال ماضی سے بھی ناز کتر ہے، کچھ تو غور کر
ساغرِ نو میں شرابِ کہنۂ اسلاف بھر
اٹھ ندامت کو مٹا
وضع کر آئین نیا
قومِ خفتہ کو جگا
جگمگا دے نورِ شمعِ عشق سے کون و مکاں
پھر وہی جذبات ہوں ہر قلبِ مردہ میں جواں
اے مرے ہندوستاں

اس طرح کب تک رہیگا تو اسیرِ یاس و غم!
تابکے مل کر نہ بیٹھینگی تری قومیں بہم!

تابکے شیخ و برہمن، تا کجا دیر و حرم!
یہ عداوت تا کجا!
یہ جہالت تا کجا!
بغض و نفرت تا کجا!

اس طرح تو اور بھی بڑھ جائینگی ناکامیاں
اتفاقِ باہمی سے ہے نشاطِ جاوداں
اے مرے ہندوستاں!

ان کا پیغام محبت جہاں تک پہنچ سکتا ہے، وہ اسے وہاں تک پہنچانے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ وہ وطن کو آزاد دیکھنے کے متمنی تھے ہیں۔ یہ نظم انھوں نے دیوبند میں ۱۹۳۳ء میں کہی، جب ملک ہر طرح کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی بحران سے گزر رہا تھا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے خدا سے بھی مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

اگر خدا ہے، تو کیوں نہیں ہے تمام دنیا، وفا کی حامی!
کہیں حکومت ہے مست و سرخوش، تڑپ رہی ہے کہیں غلامی

وہ اپنے وطن کی دیرینہ عظمت کی یاد میں کھو جاتے ہیں اور یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں:

ہوئی مدت کہ اک تارا فلک پر جگمگاتا تھا
سرور و کیف میں ڈوبے ہوئے نغمے سناتا تھا
بلندی سے شعاعیں پھینکتا تھا اہلِ عالم پر
رموزِ عیش کرتا تھا نمایاں بزمِ ماتم پر
زر و سیم و جواہر دہر والوں میں لٹاتا تھا
نشانِ تاریکیوں کا نور سے اپنے مٹاتا تھا
کیا کرتا تھا صبح و شام سجدے آفتاب اس کو
دیا کرتا تھا بوسے بزمِ گردوں کا شباب اس کو

ضیا صاحب وطن کو بار بار مخاطب کر کے اور اس کی دیرینہ عظمت کے گُن گا گا کر، اپنے فن کی جولانی دکھاتے ہیں، لیکن ان کا اصلی مقصد ہندستانی قوم کو جگانا اور اس قوم کے متوالوں کی رگوں میں خون محبت کا دوڑانا ہے۔ ان کی نظم "ہندستانی نوجوان سے" سنیے:

ہیں جواں چہرے پہ کیوں آثارِ نوامیدی عیاں؟
کیا پسند آئی نہیں تجھ کو بہارِ گلستاں؟

جلوہ زارِ گل سے کیا محظوظ تو ہوتا نہیں؟
نغمۂ بلبل سے کیا محظوظ تو ہوتا نہیں؟
کیا رگوں میں ہو گیا ہے منجمد خونِ شباب؟
کیوں نہیں ہے نوجوانی میں بھی مجنونِ شباب؟
سوچتا کیا ہے مآلِ گردشِ شام و سحر
تو زمیں پر ہے، مگر افلاک پر تیری نظر
چشم بینا ہے تو کر نظارۂ بزمِ جہاں
یوں جوانی میں نہیں زیبا مآل اندیشیاں
تو نے دیکھے ہیں کہاں اب تک بلند و پستِ دہر
کیا کرے گا اے غلط اندیش! بند و بستِ دہر
نوجواں ہے، استوارہ، دنیا کی کچھ پروا نہ کر
خوف کیسا مشکلوں کا سامنا کر بے خطر
دور ہے منزل ابھی، دشوار راہوں سے گذر
قوتوں سے کام لے، ذوقِ عمل پر رکھ نظر
دے جہاں والوں کو تو بھی زندگانی کا ثبوت
زندگانی کا ثبوت، اپنی جوانی کا ثبوت

یاس و غم کا اپنے چہرے سے اٹھا بھی دے نقاب
جلوہ گر پردوں سے ہو نیرابہ خورشید شباب
گل تبسم ریز ہیں، سامان رست و خیز کر
خونِ گرم زندگی اپنی رگوں میں تیز کر

ضیا صاحب کی حب الوطنی کے جذبات سے بھری نظمیں پڑھ کر سونے اور رونے کو جی نہیں چاہتا، بلکہ بیداری کی کسک سینے میں پیدا ہوتی ہے، باعمل رہنے کا جذبہ اُبھرتا ہے، اور حصولِ آزادی کی تمنّا من میں سرسراتی ہے:

وہ دیکھو مشرق سے نُور ابھرا، لیے ہوئے جلوۂ حقیقت
مجاز کی ترک کر غلامی کہ تُو تو ہے بندۂ حقیقت

ان کی حب الوطنی میں تنگ نظری نہیں، وہ آفاقی رنگ میں رنگی ہے۔ وہ انسان دوستی کے پیامبر ہیں اور اسے دنیا کی راحت کا موجب سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

کافر بنا دیا کہ مسلماں بنا دیا
اللہ کا شکر کر تجھے انساں بنا دیا

جب لوگ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی بننے کے بجائے انسان بنتے ہیں، تو انھیں زندگی خوشگوار نظر آتی ہے، اندھیروں کی جگہ روشنی دکھائی دیتی ہے، نفرت کے جذبے محبت میں بدل جاتے ہیں۔ یہی احساسِ بیداری ان کی شاعری کی جان ہے۔ یہی لائحہ عمل ان کی تگ و دو کا نصب العین ہے۔ جب وہ گوبند وال کو چھوڑ کر لاہور آتے ہیں، تو انھیں اپنا گاؤں یاد آتا ہے۔ لکھتے ہیں:

وطن میں رہنے والوں کو وطن کی قدر و قیمت کیا
جو مہجورِ وطن ہیں، کچھ انھیں ہے اس کا اندازہ
مرے دل کو وطن کی قدر ہے، محسن یا بُرا مِرا

وطن سے دور ہوں، لیکن وطن سے پیار کرتا ہوں

نہ دن کو چین حاصل ہے، نہ شب بھر نیند آتی ہے
خزاں مجھ کو رُلاتی ہے، نہ فصلِ گل ہنساتی ہے
وطن کی یاد آ آکر مجھے وحشی بناتی ہے
وطن سے دور ہوں، لیکن وطن سے پیار کرتا ہوں

ابھی تک یاد ہے مجھ کو وطن سے جب ہوا رخصت
عزیز و اقربا کی، آہ کیسی غیر تھی حالت
بدل ڈالوں، اگر قابو میں ہو میرے مری قسمت
وطن سے دور ہوں، لیکن وطن سے پیار کرتا ہوں

جہاں میں نے سُنا، میرے وطن سے کوئی آیا ہے
وہیں سینے سے اس کو دوڑ کر میں نے لگایا ہے
وہیں بدقسمتی نے روز و شب مجھ کو رُلایا ہے
وطن سے دور ہوں، لیکن وطن سے پیار کرتا ہوں

۱۹۴۷ء کے بعد جب آزادی کی دیوی ہندستان میں جلوہ نما ہوتی ہے، تو وہ گلی گلی میں لہراتے ہوئے ترنگے کو دیکھ کر سرمست ہو جاتے ہیں، اور لکھتے ہیں:

آج ہمالہ کی چوٹی پر
لہراتا ہے جھنڈا سُندر
اُونچا ہے اب اپنا بھی سر
روشن اپنا نام، اپنے جھنڈے کو پرنام

اپنا جھنڈا سب سے پیارا
بھارت کی آنکھوں کا تارا
ہم نے اس پر تن من وارا
ہم کو اس سے کام، اپنے جھنڈے کو پرنام

اس کی جھاڑی میں آزادی
اس کی گود میں سکھ اور شادی
آشا کی بگیا مسکا دی

یہ جیون آرام، اپنے جھنڈے کو پرنام

وہ وطن کے آزاد ہونے پر اتنا خوش ہوئے کہ انھیں آزاد ہند کی دیوالی بہت پیاری لگتی ہے :

رات اندھیری شمعیں روشن — دل مسرور و شاد ہے اپنا
جھلمل جھلمل حال کا درپن — بھارت اب آزاد ہے اپنا

ماضی کا کیوں ذکر کریں ہم
مستقبل کی فکر کریں ہم

آج کی رات ہے کتنی پیاری — جیسے من پر پریم کہانی
دھرتی اور آکاش پہ ساری — مُدرا کی سرمست جوانی

ٹوٹیں آ کر لٹ جائیں آؤ
جیون کا سکھ پائیں آؤ

آزادی کے ایک سال بعد وہ حصولِ آزادی کے سلسلے میں اپنے ہموطنوں کی قربانیوں کا ذکر یوں کرتے ہیں :

ہم نے آزادیِ وطن کے لیے — کھو کے سب کچھ ذرا گلا نہ کیا
آخرِ کار بڑھتے طوفاں کو — اپنی جانیں گنوا کے روک دیا

وطن سے ان کی محبت جب ترانۂ آزادی بن کر ابھرتی ہے، تو ان کے احساسات جذبات ارمان نغمہ بن کر ابھرتے ہیں :

آزادی کے ہم دیوانے — آزادی کے ہم پروانے

جانیں دے کر بھی ہیں شاد
ہندستان آزاد ہمارا ہندستان آزاد

گاندھی نے وہ راہ دکھائی منزل خود لینے کو آئی
دشمن آپ ہوئے برباد
ہندستان آزاد ہمارا، ہندستان آزاد
آزادی کے نغمے گائیں جھوم میں سب کو وجد میں لائیں
بھولیں ہم نالۂ فریاد
ہندستان آزاد ہمارا، ہندستان آزاد
نفرت کی بنیاد ہلا دیں پریم کو ہر سینے سے لگا دیں
ایک ہیں اب صید و صیاد
ہندستان آزاد ہمارا، ہندستان آزاد
گنگا جمنا اور ہمالہ مسجد مندر اور شوالہ
رہتی دنیا تک آباد
ہندستان آزاد ہمارا، ہندستان آزاد

آزاد وطن میں جب ۲۶ جنوری آتی ہے، تو ان کا من خوشی سے ناچنے لگتا ہے۔۔۔ وہ اپنی مستی اور دیش باسیوں کی خوشی کا بیان اس طرح کرتے ہیں:

ہر سر میں خودسری ہے ہر دل میں بیخودی ہے
ہر سو نئی خوشی ہے ہر سمت روشنی ہے
مسرور زندگی ہے
چھبیس جنوری ہے
اے موسم بہاراں! اے نکہت خراماں!
اے شاخ گل بداماں اے طائر خوش الحاں!
اک نغمۂ صد عنواں
چھبیس جنوری ہے
دیوار و در ہیں رقصاں برگ و ثمر ہیں رقصاں

قلب و نظر ہیں رقصاں　　شمس و قمر ہیں رقصاں

شام و سحر ہیں رقصاں

چھبیس جنوری ہے

دل گنگنا رہا ہے　　جھولے جھلا رہا ہے

خوشیاں منا رہا ہے　　شمعیں جلا رہا ہے

ہمت بڑھا رہا ہے

چھبیس جنوری ہے

ہم مجرمانِ الفت　　ہیں ناشناسِ نفرت

بھارت ہے ارضِ جنت　　تھا خواب ہے حقیقت

پیغامِ عیدِ عشرت

چھبیس جنوری ہے

اے گنگ، اے ہمالہ!　　شبنم ہو یا ہو شعلہ

اب دل میں ہے ارادہ　　اونچا رہے ہمیشہ

ہر حال میں ترنگا

چھبیس جنوری ہے

وہ جہاں وطن سے بے پناہ محبت کرتے ہیں، وہیں وہ اس پاسبانِ وطن کو بھی یاد رکھتے ہیں، جو سردی ہو یا گرمی، میدان ہو یا پہاڑ، سمندر ہو یا خشکی، دن ہو کہ رات، ہر وقت کمربستہ رہ کر وطن کی آزادی، وطن کی شان کو برقرار رکھنے کے لیے سینہ سپر رہتا ہے۔ وہ ہے محافظِ وطن، دیش کا سپاہی:

سمن کو تجھ پہ ناز ہے　　چمن کو تجھ پہ ناز ہے

وطن کو تجھ پہ ناز ہے　　تیری زمیں تیرا گگن

مرے سپاہیِ وطن

وطن کی آن تجھ سے ہے　　وطن کی شان تجھ سے ہے

وطن مہان تجھ سے ہے مہان تیرا علم و فن
مرے سپاہیِ وطن

وطن سے تجھ کو پیار ہے وطن پہ تو نثار ہے
وطن کا غمگسار ہے نہ فکرِ جاں، نہ فکرِ تن
مرے سپاہیِ وطن

جفا سے تجھ کو دشمنی وفا سے تیری دوستی
شکوہ و شانِ آدمی غرور و نازشِ وطن
مرے سپاہیِ وطن

ہے یارِ غارِ امن تو نگاہدارِ امن تو
نشاط کارِ امن تو سکون نوازِ انجمن
مرے سپاہیِ وطن

اور وطن کے سپاہی کے علاوہ ضیا صاحب نے وطن کے جان نثار دل کی یاد کو بھی اپنے ہموطنوں کے دل میں قائم رکھنے کے لیے اپنی نظم "امر پروانہ" میں لکھا ہے:

رات کی ظلمت سے گھبرا کر
ایک دیوانے پروانے نے
خود اپنے ہی سوزِ دروں سے
روشن کر دی شمعِ محفل

پھیلایا ہر سمت اجالا
خوابیدہ دنیا کو جگایا
وقت کے دھارے کا منھ موڑا
دی اندھوں کو چشمِ بینا
گونگوں کو تابِ گویائی
بہروں کے کانوں میں پھونکی

پھر آزادی کی شہنائی
پھر سورج کی پہلی کرن نے
مشرق کے روزن سے جھانکا

دیوانے پروانے نے پھر
خود ہی خود کو آگ لگائی

اپنی جلائی شمع کی لو پر
جل کر راکھ ہوا دیوانہ

امر ہوا مر کر پروانہ

اور اسی سلسلے میں وہ مہان پُرش مہاتما گاندھی کو خراجِ عقیدت یوں پیش کرتے ہیں:

موت کو بھی تو نے دیکھا، زندگی کے رُوپ میں
واقعی تو دیوتا تھا، آدمی کے رُوپ میں

کیا برہمن، کیا ہریجن اور کیسی جات پات
ایک ہی منزل کی جانب ہیں رواں گنگ و فرات

تو نے کھادی اور چرخے سے لیا درسِ حیات
یہ وہی محور ہے جس پر گھومتی ہے کائنات

تو نے ثابت کر دیا تدبیر سے تحقیق سے
پھولتا پھلتا نہیں انسان کبھی تفریق سے

کر دیئے ہموار تو نے کیا نشیب اور کیا فراز
اور مٹایا ہندو مسلم میں جھوٹا امتیاز

رام و کرشن کی بانسری میں بھر دیا سوز و گداز
تو ہی تھا دورِ جہالت میں فقط دانائے راز

تیری امیدیں تھیں وابستہ نئے انسان سے
پریم گیتا سے، تو تجھ کو عشق تھا قرآن سے

اب بھی تیرے نام پر آگے بڑھے جاتے ہیں ہم
اب بھی تیرے حوصلوں سے زندگی پاتے ہیں ہم
ہم نے دیکھا ہے تجھے قسمت پہ اتراتے ہیں ہم
آج پھر ایمان تیری ذات پر لاتے ہیں ہم

تو نے جو ہم کو دکھایا روشنی کا راستہ
عہد کرتے ہیں چلیں گے اس پہ ہم صبح و مسا

ضیا صاحب جو کچھ بھی لکھتے ہیں موضوع میں ڈوب کر لکھتے ہیں۔ یہی حب الوطنی انھیں مجبور کرتی ہے کہ وہ انسان دوستی کے وقار کے نغمے سنائیں۔ "انسان بیدار" میں وہ یوں نغمہ سرا ہیں:

جاری ہے نیرنگی چھا گئی ہے روشنی
مسکراتی ہے کلی ہے فضا نکھری ہوئی
طائرانِ خوش نوا
نغمہ ہائے دلربا
مستیوں کا سلسلہ
گنگناتی ہے حیات رقص میں ہے کائنات
باخبر ہشیار ہے آدمی بیدار ہے
رشکِ گردوں ہے زمیں ہے یہ دورِ بہتریں
غم کسی دل میں نہیں ہمت و عزم و یقیں
رہنما و راہبر
ٹھوکریں ہیں رہگذر
ختم ہونا ہے سفر
ظلم و استبداد کا اب زمانہ ہو گیا
باخبر ہشیار ہے آدمی بیدار ہے

صبح نو آہی گئی نور پھیلا ہی گئی
باغ پر چھا ہی گئی کیف برسا ہی گئی
پتی پتی اک گلاب
قطرہ قطرہ موجِ آب
ذرہ ذرہ آفتاب
راز افشا ہو گیا خواب سچا ہو گیا
باخبر ہشیار باش آدمی بیدار ہے

اور وہ انسانیت کا درس دینا ہی اپنا ایمان سمجھتے ہیں:

دو دھرم کو آواز، نہ انسان کو پکارو
انسان کی ضرورت ہے اب انسان کو پکارو

آزادی وطن ہو کہ حب وطن، بھارت کی گلی کوچے ہوں کہ تاج محل، وطن کے معمولی باشندے ہوں کہ اس کے قائد، چھوٹے سے چھوٹا موضوع بھی ضیا صاحب کو نظم کرنے کے لیے بھڑکاتا ہے۔ اس کو وہ وجدانی کیفیتوں میں کیا کچھ نہیں کہہ جاتے ہیں۔ ان کے خیالات قومی زندگی، یکجہتی، حب الوطنی کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ وہ جس قدر خود نیک اور خوش خلق ہیں، اتنی ہی ان کی شاعری ان کے قول و فعل کا آئینہ ہے۔ شدتِ احساس کے باوجود وہ صراطِ مستقیم سے بھٹکتے نہیں۔ جہاں وہ خود نیک اور سیدھے رستے پر چلنے کے قایل ہیں، وہیں اپنے ہموطنوں کو میل، محبت، خلوص، رواداری و ایثار کی تعلیم دیتے ہیں۔ یہی وہ جذبات ہیں جو انسان کے دل میں خدمت وطن کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ آزادی سے پہلے کی نظموں میں جہاں ہندستان کے ماضی کی عظمت کے ترانے چھیڑے ہیں، اب وہ ہمیں اچھے مستقبل کے لیے کمربستہ ہونے کے لیے کہتے ہیں۔ دیش سے بیکاری، ناداری، نفرت کو دور کرنے کا سبق دیتے ہیں۔ وطن کے لئے ایثار، قربانی، شہادت دینے والوں سے عقیدت پیدا کرتے ہیں۔ جان نثار وطن کے سپاہی کے ترانے گا کر دلوں میں جذبۂ حریت پیدا کرنے کی کوشش

کرتے ہیں۔ جہاں وہ اپنے ہموطنوں کی کمزوریوں سے واقف ہیں، وہیں وہ ہمیں سکھاتے ہیں کہ ہمیں بری باتوں سے احتراز کرنا چاہیے۔ نفرت، نفاق سے دور رہنا چاہیے۔ شاعری ایک پیغام ہے، نعرۂ بیداری ہے لیکن ان کا رنگِ شاعری اپنے پیشروؤں اور اپنے ہم عصروں سے بالکل جداگانہ ہے۔ اس میں میٹھا میٹھا احساس ہے، شیرینی ہے، جو لذتِ کام و دہن پیش کرتی ہے۔

سرتاج عالم عابدی

ضیا کے قطعات

اور

رباعیات

آج سے ۱۴-۱۵ سال پہلے موسمِ سرما کی ایک خنک شب کو اپنے محبِّ صادق اوم پرکاش بجاج کے ہمراہ میں مان نگر نئی دہلی کے ایک سرکاری مکان میں ایک مخصوص ادبی نشست میں شرکت کے لیے گیا۔ وہاں ایک اکہرے جسم کے مجسمۂ اخلاق سے بہ حیثیت میزبان کے ملاقات ہوئی۔ یہ تھی میری جناب ضیا فتح آبادی سے پہلی ملاقات ــــ اس محفلِ شعر و سخن میں جناب طالب دہلوی، منور لکھنوی، خوشتر گرامی، علیم اختر مظفر نگری اور نوجوان شعراء میں جناب شہر یار پرواز۔ اوم پرکاش بجاج وغیرہ شریک تھے۔ پہلا دور کوئی دس بجے تک چلا۔ میری نگاہیں ضیا صاحب پر مرکوز رہیں، جو اپنے مہمان شعراء کے کلام پر کھلے دل سے داد دے رہے تھے۔ معمولی شعر پر اخلاقی مسکراہٹ اور عمدہ شعر پر دلی تعریف۔ اس سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ ضیا صاحب منصفانہ مزاج کے مالک ہیں اسخن فہمی و نکتہ رسی میں خوب دسترس حاصل ہے۔ اس محفل کے درمیانی وقفہ میں ضیا صاحب نے شعراء کے لیے پُر تکلف عشائیہ کا اہتمام کیا تھا۔ میز پر گوشت اور ترکاریاں دونوں طرح کے کھانے چنے گئے تھے اور شعراء اپنے اپنے مذاق کے مطابق سیر ہو رہے تھے۔ رات گئے دوسرے دور کا اختتام ہ

اس کے بعد ضیا صاحب کا کلام گاہے بگاہے بیسویں صدی اور دوسرے رسائل میں نظر سے گذرتا رہا اور پھر ۱۹۷۰ء میں راما کرشن پورم کے "حلقۂ تشنگانِ ادب" کی ماہانہ نشستوں میں ان سے تجدیدِ ملاقات ہوتی رہی۔ اب ضیا صاحب کو قریب سے دیکھنے اور ان کا کلام سننے اور پرکھنے کا ہر ماہ موقع ملتا رہا۔

بس اس مختصر مضمون میں ضیا صاحب کی رباعیات اور قطعات پر ایک طائرانہ نظر ڈالونگا اور جو کچھ میں نے محسوس کیا ہے، اس کے مطابق اظہارِ خیال کرونگا۔ ضیا صاحب کے تین شعری مجموعوں میں رباعیات اور قطعات، دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ شامل ہیں۔ ان کو اگر تاریخی اعتبار سے ترتیب دیں، تو ذیل کی شکل سامنے آئیگی:۔

(الف) طلوع (۱۹۳۴ء)؛ (ب) نئی صبح (۱۹۵۲ء)؛ اور (ج) گردِ راہ (۱۹۶۳ء)

یہ حقیقت ہے کہ عمر کی مناسبت سے تجربات حاصل ہوتے ہیں، اور شاعر کے کلام میں بھی شعور کی پختگی جھلکنے لگتی ہے "طلوع" کی رباعیات اور قطعات کا جائزہ لیا جائے، تو قاری کو یہ معلوم ہو جائیگا کہ ضیا صاحب کی نظر کتنی وسیع ہے۔ ان کی رباعیات میں لطیف احساسات، ہمتِ مردانہ، عزمِ جواں، خودداری، خوداعتمادی، دعوتِ عمل، تصوّف، معرفت اور حسنِ زندگی جیسے اجزا مل جائینگے۔

اب ہم ان کی رباعیوں میں مذکورہ بالا عناصر کی تلاش کرتے ہیں۔ اس رباعی میں احساسِ لطیف، جو کسی مہربان اور دردمند دل کا حصہ ہوتا ہے، کس قدر واضح ہے:

چھٹپٹا وقت۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا   آسمان پر خرام بادل کا
جان و دل کو خرید لیتی ہے   ایسے عالم میں بانسری کی صدا

دعوتِ عمل، بلند حوصلگی اور جرأتِ رندانہ کی مثال ملاحظہ ہو:

ہے مخالف اگر جہاں، پھر کیا   تیغ بر سر ہے آسماں، پھر کیا
پائے میرے نہ ڈگمگا ئینگے   سخت مشکل ہے امتحاں پھر کیا

کام دیتی نہیں ہے کچھ تقدیر
ساتھ جب تک نہ اس کے ہو تدبیر
ہے مرا تجربہ کہ دونوں میں
ایک پر ہے تو ایک نوکِ تیر

فائدہ کیا تمہارے ڈرنے سے
رات دن آہِ سرد بھرنے سے
ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے ہو
کچھ نہیں ہوتا، کچھ نہ کرنے سے

دست و پا تو ہلائیے حضرت!
کچھ مشقت اٹھائیے حضرت!
وقت باتوں کا اب نہیں باقی
کام کرکے دکھائیے، حضرت

خود اعتمادی اور خودداری کی کیسی جامع تصویر کھینچی ہے:

شمعِ احساس جلتی رہتی ہے
آگ دل میں اُبلتی رہتی ہے
لب پہ آتا نہیں مگر شکوہ
چپکے چپکے پگھلتی رہتی ہے

مفلسی کا گلہ کروں، توبہ!
بے بسی کا گلہ کروں، توبہ!
بیوطن ہوں، وطن سے کوسوں دور
پھر کسی کا گلہ کروں، توبہ!

ذیل کے قطعات میں اعترافِ تخلیقِ یزداں و معرفتِ حق ملاحظہ کیجیے:

ہے انسان مجسّم کمالِ الٰہی
امینِ صفاتِ و جلالِ الٰہی
نگاہِ بصیرت سے کر غور، غافل!
تجھی میں چھپا ہے، جمالِ الٰہی

سرسبز ہے گلزارِ جہاں ابرِ کرم سے
ہر پھول یہاں کا ہے حسین باغِ ارم سے
بے جسم بھی، باجسم بھی ہے، تیری تجلّی
یہ راز کھلا سیرِ کلیسا و حرم سے

کتنا خوبصورت شاعرانہ استدلال ہے:

دیکھ کر بے نقاب جلوۂ نور
ہو گیا تھا سیاہ دامنِ طور
اس سے ثابت ہوا کہ دنیا میں
ظلمتیں بھی ہیں نور میں مستور

باوجود اپنی تلخیوں اور مصائب کے زندگی میں ایک حُسن ہے جسے ضیا صاحب کی شاعرانہ نگاہ نے بھانپا ہے:

نا امیدی ہے، بیقراری ہے
دن پہاڑ اور رات بھاری ہے
لیکن اس پر بھی لطف یہ ہے ضیا!
زندگی جان سے بھی پیاری ہے

ساحر لدھیانوی نے کیا خوب کہا ہے:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں جو کچھ مجھے دیا تھا، وہ لوٹا رہا ہوں میں
ایک شاعر اپنے تجربات کو جو آپ بیتی بھی ہوتے ہیں اور جگ بیتی بھی، جن کو نثر کی شکل میں پڑھا جائے، تو وہ بالکل بے کیف و بے رنگ نظر آئینگے، شعری سانچے میں ڈھال کر طلسمی تاثر دے دیتا ہے۔ ضیا صاحب نے "نئی صبح" میں کبھی جوانی اور وصال و فراق کے نغمے گائے ہیں، کہیں تابعینِ مذہب کی تنگ نظری پر ملامت کی ہے، اور کہیں فرسودہ روایات کی غلامانہ پیروی کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔
اب ان موضوعات کو واضح کرنے والی چند رباعیات اور قطعات دیکھیے۔
شباب کے موضوع پر دس رباعیات ہیں۔ ان میں یہ بھی ہیں:

پھولوں کا نکھار، ہے جوانی میری کہسار ہے بہار، ہے جوانی میری
اے بادِ صبا! تیری لطافت کی قسم مستی بکنار، ہے جوانی میری
گلشن میں غزلخواں ہے جوانی میری کہسار پہ رقصاں ہے جوانی میری
ساحل بھی ہوئے ہیں اس کے آگے پامال اک موجۂ طوفاں ہے جوانی میری

ضیا صاحب کی انسانیت نواز نظر کو مذہبی تعصب سخت ناگوار ہے:

اپنے ہیں پرائے، دوستی دھوکا ہے ہر سر میں یہی جنوں، یہی سودا ہے
مذہب ہی وہ کیا جس کی ہو ایسی تعلیم انسان کو انسان سے ڈر لگتا ہے

علّامہ اقبال کے انداز میں دعوتِ عمل ملاحظہ ہو:

پھیلا کے ترے حضور بانہیں، یا رب! لیتا ہے مقدر کی پناہیں، یا رب!
انسان ابھی تک، ہے جہالت کا شکار دے اس کو بصیرت کی نگاہیں، یا رب!

عرصۂ فراق کو شعرا نے نہایت کربہ اور جانسوز باندھا ہے۔ ضیا صاحب نے منفرد انداز سے اس کو نظم کیا ہے:

بیخودی میں اسیر رہتا ہوں غم کو شادی سمجھ کے سہتا ہوں
لوگ جس کو فراق کہتے ہیں میں اسی کو وصال کہتا ہوں

اشجار کی شاخوں سے نورِ قمر کے چھن چھن کر آنے کو کیسے دلکش پیرائے میں نظم

کرتے ہیں:

کنجِ خلوت میں، نرم پتّوں سے — چاندنی یوں نکھر کے آتی ہے
جیسے سمٹی ہوئی عروسِ نو — سر سے پا تک سنور کے آتی ہے

ضیا صاحب کی حُریت پسند طبیعت روایات کی اسیری قبول نہیں کرتی:

جدھر بھی موڑ دے رُخ وقت کی رفتار، برحق ہے
یہاں بھیڑیں ہی بھیڑیں ہیں، لکیری کی فقیری ہے
مری آوارگی دراصل ہے پیغامِ آزادی
کہ پابندی اصولوں کی بہ اندازِ اسیری ہے

ضیا صاحب نے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا ہے۔ گویا انھوں نے کسبِ خیالات و احساسات مشرقی اور مغربی دونوں ادبی سرمایوں سے کیا ہے۔ ان کے کلام میں شیلے کی اڑان اور ورڈس ورتھ کا عشقِ فطرت ہے۔ اگر کیٹس نے بلبل، خزاں اور یونانی کاسۂ خاکستر کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے، تو ضیا صاحب نے گردِ راہ میں صبرِ ذاتی، قوتِ عزائمِ انسانی، تسخیرِ نجوم، دیوالی، آزادی، اردو زبان، ساقی، حسن و شراب اور حبِ وطن کے ترانے گائے ہیں۔ دیکھیے یہ رباعیات کتنی خوبصورت ہیں۔ صبرِ ذاتی کی اس سے بہتر تشریح کیا ہو سکتی ہے! آخری مصرع کتنا فنکارانہ ہے!

شعلوں سے دھونا بھی نہ آیا مجھ کو — دامن کو بھگونا بھی نہ آیا مجھ کو
بیدرد جہاں سہہ گیا ہنستے ہنستے — روتا ہوں کہ رونا بھی نہ آیا مجھ کو

جب انسان سچی لگن سے کسی کام کی تکمیل کا عزم کرتا ہے، تو محالات بھی امکانات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور اس کا یہی جذبہ اسے کامرانی سے ہمکنار کرتا ہے۔ یہ رباعی اسی عزمِ صمیم کو آشکار کرتی ہے:

چلتا ہے، تو آندھیوں کا یہ بن آتی ہے — رکتا ہے تو کائنات رک جاتی ہے
یہ تیرا ہی جذبۂ عمل ہے اے دل! — تدبیر جو تقدیر سے ٹکراتی ہے

تسخیرِ نجوم صرف ایک انسانی خواب تھا لیکن یقینِ محکم اور عملِ پیہم نے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر بھی کر دیا اور سطحِ قمر پر انسانی قدموں کے نشان بنے۔ ضیا صاحب نے انسان کے اس جذبے کو سراہا ہے:

سانچے میں خلا کے ہم نے گیندیں ڈالیں
مہر و مہ و انجم پہ کمندیں ڈالیں
دھرتی نے، فلک نے، نور نے، ظلمت نے
انسان کے ارتقا کی قسمیں کھالیں

تدبیر سے تقدیر بنانے والے
انسان کو نئے موڑ پہ لانے والے
روندے ہوئے ذرّوں پہ چھپاتی سی نظر
تاروں کی طرف پاؤں بڑھانے والے

ان کے ہاں دیوالی کے موضوع پر چار رباعیاں ہیں۔ ان میں سے ایک ملاحظہ کیجیے:

ہے فرش سے تا بہ چرخ دیپوں کی قطار
نکھرا ہوا رنگِ گل ہے، رقصاں ہے بہار
ظلمت کدۂ دل مرا روشن ہو جائے
آجاؤ جو دیوالی کا تم بن کے سنگھار

آزادی اور اردو زبان کی تعریف میں بھی چار چار رباعیاں ہیں، جن میں سے دو نقل کرتا ہوں:

میخانۂ ہستی کا سرور آزادی
انسان کی عظمت کا شعور آزادی
معلوم ہوا ضیا! یہ ہو کر آزاد
ہے خوئے غلامی کا غرور آزادی

تابندہ و روشن ہے جبینِ اردو
خورشیدِ ادب، ماہِ مبینِ اردو
گہوارۂ ارتقائے تہذیب و ادب
انداز و ادائے دلنشینِ اردو

ضیا صاحب کے کلام کی تفصیلی سیر اور مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات بالکل روشن ہو جاتی ہے کہ انھوں نے شوکتِ الفاظ کا سہارا نہیں لیا، بلکہ اس میں شدتِ احساس کی گرمی اور تجربات کی سچائی ملتی ہے اور بقول اقبال:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

جس طرح ایک ناول نگار اپنے سامنے کائنات کی ہر شے کو دیکھتا ہے اور کوئی چیز اس کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی، وہ ان اشیا، مناظر اور کرداروں کے سانچے میں ڈھال کر اپنے ناول کے لیے مواد مہیا کرتا ہے اسی طرح ایک شاعر

نہایت باریک بین اور وسیع المشاہدہ ہوتا ہے۔ وہ اشعار کی شکل میں اپنے محسوسات اور تجربات کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ ضیا صاحب نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، اس کو عروج بخشا۔ ان کی رباعیات وقطعات میں عزم انسانی، دعوتِ عمل، آزادی، حسن وعشق، شراب وشباب، ساقی، اردو پرستی، حبِ وطن، خودداری، معرفتِ الٰہی، فراق ووصال وغیرہ کی مضمون آفرینی ملیگی۔ الفاظ کے دروبست اور ان کے محلِ استعمال، خوبصورت تشبیہات اور شاعرانہ استدلال نے ان کے کلام کو بیحد دلکش اور دلنشیں بنادیا ہے۔

اندر موہن مہتہ

ضیا فتح آبادی میری نظر میں

شری ادم پرکاش بجاج نے باتوں باتوں میں جب ضیا صاحب فتح آبادی کا ذکر کیا تو میرے ذہن میں ان کے کلام سے متعلق بھولے بسرے تاثرات تازہ ہو گئے اور میں نے اسی وقت ان سے تقاضا کیا کہ وہ مجھے ضیا صاحب کے کلام کے مجموعوں کو فراہم کر دیں۔

ہندستان کی تقسیم سے پہلے مجھے اکثر ساقی، شاعر اور دوسرے رسالوں میں ضیا صاحب کا کلام پڑھنے اور اس سے محظوظ ہونے کا موقع ملا تھا۔ مگر اس کے بعد زندگی کی مجبوریوں نے مجھے کچھ ایسی راہوں پہ ڈال دیا تھا کہ ادبی حلقوں اور ادیب دوستوں سے میری رسم و راہ یکسر منقطع ہو گئی۔ ایک مدت بعد حسنِ اتفاق سے یہ یادیں پھر سے تازہ ہو گئیں۔ چند دن ہوئے، ایک عزیز نے مجھے ضیا صاحب کے کلام کے تینوں مجموعے "طلوع"، "نور مشرق" اور "نئی صبح" لا کر دیئے، جس سے مجھے ضیا صاحب سے متعلق یہ چند سطریں لکھنے کی ترغیب ہوئی۔

میں شاعر ہوں، نہ نقاد۔ میں تو صرف ضیا صاحب کا ایک نادیدہ مدّاح ہوں۔ ان سے ذاتی طور پہ متعارف بھی نہیں البتہ ان کا کلام مجھے پسند ہے۔ ایک شاعر

کی حیثیت سے میرے نزدیک ان کا رتبہ اس لیے بھی بلند ہے کہ انھوں نے نہ صرف انگریزی ادب سے حاصل کردہ تاثرات کو اردو شاعری کے قالب میں ڈھالا، بلکہ انگریزی کی صنفِ سخن سانیٹ میں بھی کامیاب تجربے کیے اور اسے مشرقی جذبات سے مزین کیا۔ اختر شیرانی کے بعد مجھے ضیا ہی کے کلام میں ایسے سانیٹ ملے ہیں، جو فن اور فکر کے اعتبار سے بلند پایہ ہیں۔ ان کا اندازِ بیان بہت سلجھا ہوا، اور الفاظ کا انتخاب بہت پیارا ہے۔

ضیا آگرہ سکول سے متعلق ہیں۔ اس لیے فن اور زبان دانی ان کی گھٹی میں داخل ہیں۔ اس پر ایف سی کالج، لاہور کی تعلیم نے سونے میں سہاگے کا کام کیا۔ غزل ہو یا نظم، رباعی ہو یا قطعہ، گیت ہو یا سانیٹ۔ انھوں نے ہر صنفِ سخن میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام میں ادب بھی ہے اور زندگی بھی، فکر کی آزادی بھی ہے اور فن کی پابندی بھی، ادبی روایتوں کا احترام بھی ہے اور زندگی کی نئی قدروں کا احساس بھی۔ وہ وقت کی نبض کو پہچانتے ہیں اور انھیں انسان کی عظمت پر کامل یقین ہے۔ دیکھیے، انھیں جذبات کو تغزل کی چاشنی دے کر کس خوبی سے ادا کیا ہے:

تاروں کو درخشاں دیکھ چکے، ذروں کو درخشاں دیکھینگے
اے سوزِ محبت! ہم تجھ کو ہر شے میں نمایاں دیکھینگے

میرے نزدیک "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" میں کوئی فرق نہیں ہے۔ زندگی ادب کی محرک ہے، تو ادب زندگی کا آئینہ دار۔ شاعری نام ہے شاعر کے تاثرات اور تجربات کو چاہے ان کا محرک خارجی ہو یا داخلی، موزوں الفاظ میں نظم کرنے کا۔ ضیا صاحب کا کلام اس معیار پر ہر لحاظ سے پورا اترتا ہے۔ ان میں جب شعری شعور بیدار ہوا، اس وقت ہندستان غلامی کا جوا اتار پھینکنے کی جدّوجہد میں مصروف تھا۔ اس سیاسی دور کا احساس ان کی بیشتر نظموں، اور بعض جگہ غزل کے شعروں میں بھی پایا جاتا ہے۔

ان کی ایک نظم " اے مرے ہندوستاں " وطنیت کے جذبات سے پُر ہے، جس میں وہ صرف عظمتِ دیرینہ ہی کا ذکر نہیں کرتے، بلکہ وقت کے نئے تقاضوں کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

وقت ہے اب بھی سنبھل، اے کاروانِ منتشر!
حال ماضی سے بھی نازک ہے، ذرا تو غور کر
ساغرِ نو میں شرابِ کہنۂ اسلاف بھر
اٹھ قدامت کو مٹا
وضع کر آئیں نیا
قومِ خفتہ کو جگا
جگمگا دے نورِ شمعِ عشق سے کون و مکاں
پھر وہی جذبات ہوں، ہر قلبِ مردہ میں جواں
اے مرے ہندوستاں!

ضیا صاحب نے جہاں اپنے سیاسی اور سماجی ماحول سے متاثر ہو کر پُر از جذبات نظمیں کہی ہیں، وہیں قدرت کے دلفریب مناظر نے بھی انھیں اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان کی نظمیں " بسنت کا ترانہ "، " لو آؤ سیر کو چلیں "، " انقلابِ بہار " اور " پرندوں کا ساز " قدرت کے مناظر اور شاعر کے موڈ کی بہت اچھی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے اسلوبِ بیان میں موسیقی ہے، اور الفاظ میں روانی۔ نمونے کے لیے ان کی رومانی نظم سے ایک بند پیش کرتا ہوں۔ عنوان ہے " دعوتِ نظر ":

تمھاری اک نظر کا انتظار مدتوں سے ہے
دلِ الم نصیب بیقرار مدتوں سے ہے
مری نگاہِ شوق اشکبار مدتوں سے ہے
مری طرف بھی دیکھ لو!

آپ نے اندازِ بیان کی شگفتگی اور الفاظ کی موسیقیت ملاحظہ کی۔ شعر پڑھ کے

اسے گنگنانے کو جی چاہتا ہے۔ ایک اور نظم "روح کا پیمانہ" کا ایک بند پیش کرتا ہوں:

آیا ہوں میں دور سے، ساقی! بھر دے میرا جام
کیفیت اور نور سے، ساقی! بھر دے میرا جام
نور وہ، جس سے روشن دل کا کاشانہ ہو جائے
کیف وہ، جس میں ڈوب کے ہستی میخانہ ہو جائے
زیست جسے کہتی ہے دنیا، مستی کا ہے نام
بھر دے میرا جام

اسی نوع کی بہت سی بلند پایہ اور موسیقی ریز نظمیں ضیا صاحب کے کلام میں موجود ہیں۔ "گرشن" میں انھوں نے گیتا کے دقیق فلسفہ کو چند شعروں میں بند کر دیا ہے۔ "محبت" ان کا بہت پیارا سانیٹ ہے، جس میں انھوں نے ایک وسیع مضمون کو اپنے مختصر اور محبوب انداز میں بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی نظمیں "ڈیوک آف ونڈسر" اور "گاندھی" بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

انسان ازل سے نیکی اور بدی کی کشمکش میں مبتلا ہے، اور ابد تک رہے گا۔ یہ مضمون بہت پامال ہے، اور ہر دور میں شعرائے کرام نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ مگر ضیا صاحب کی وجدانی کیفیت اور اسلوبِ بیان نے جو فضا پیدا کر دی ہے، اس سے اس قطعہ کا مجموعی تاثر بہت بڑھ گیا ہے:

اک طرف خار زارِ عصیاں کا
اک طرف باغ دین و ایماں کا
کارگاہِ جہاں میں شام و سحر
امتحاں ہو رہا ہے انساں کا

جہاں نظم میں تفصیل اور تجزیے کا ہونا لازمی ہے، وہیں غزل کی کچھ اپنی خوبیاں ہیں، جن کی آمیزش سے تغزل پیدا ہوتا ہے اور وہ ہیں، اختصارِ بیان اور الفاظ کا

ایک مخصوص لب و لہجہ۔ ضیا صاحب کی غزل میں، جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں، یہ تمام اوصاف موجود ہیں۔ وہ اس صنفِ سخن کے مزاج شناس ہیں۔ غزل کے روایتی مضامین کے علاوہ انھوں نے مختلف مضمون تنگنائے غزل میں باندھے ہیں، مگر تغزل کا دامن کہیں ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا۔ آخر میں چند اشعارِ غزل کے پیش ہیں:

کمالِ ضبط میں آنسو نکل آتے ہیں آنکھوں سے
نظامِ کائناتِ عشق برہم یوں بھی ہوتا ہے

کوئی مندر، کوئی مسجد میں، مصروفِ پرستش ہے
نہیں پایا ابھی تک تیرے بندے نے مقام اپنا

گھر کے آتا ہے، برستا ہے، چلا جاتا ہے ابر
اور پھر دل آسمان کو دیکھتا رہتا ہوں میں

غم سے نجات کیا ملے، غم جو نہیں تو کچھ نہیں
دل کی تڑپ حقیقتاً حاصلِ کائنات ہے

بسے دل میں آنکھوں سے مستور ہو کر
قریب اور بھی آ گئے دور ہو کر

منیر احمد اعظمی

ضیا فتح آبادی کے گیت

گیتوں کی کہانی نئی نہیں؛ یہ ایک لمبی داستان ہے۔ ہر زبان میں گیتوں کی تخلیق ہوئی۔ ہندی میں تو اس کے موضوع انگنت رہے ہیں، اور انگنت موضوعات کو سامنے رکھ کر لوک گیتوں کی تخلیق ہوئی۔ یہ وطن کی محبت کے گیت ہوں، یا حقِ خود ارادیت کی مانگ ہو؛ پربھو بھگتی ہو یا فطرت کی پوجا؛ عورت کے من کی پکار ہو یا کسی کو اپنی محبوبہ کا انتظار، دل سے اٹھنے والی آواز ضرور گیت میں ڈھل گئی ہے۔

گیتوں کی کہانی ویدوں سے شروع ہوتی ہے۔ سام وید گیتوں ہی کا مجموعہ ہے۔ گیت کے افق کو عام شاعروں نے عورت کے گیتوں تک محدود کر دیا۔ اردو میں اس حد کو پھاندنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ویدک ادب کے بعد بودھ ادب کی جگہ ہے۔ ان میں بیراگ کے جذبات کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

اردو کے شاعروں کو میرا بائی کے گیتوں نے متاثر کیا؛ انھوں نے اپنی تخلیقات کے لیے ان گیتوں کو نمونہ بنایا۔ لیکن ہے یہ کہ میرا کے سامنے بھگوان کرشن کا چتر تھا، چرتر تھا۔ ملاحظہ ہو:

میرے تو گردھر گوپال، دوسرا نہ کوئی
جا کے سر مور مکٹ، میرو پتی سوئی

چھانڈ دی کُل کی کانی کہاں پھرے کوئی
سنتوں ڈِھنگ بیٹھ، لوک لاج کھوئی
میں تو سانورے کے رنگ راچی
ساجی سنگار، باندھی پگ گھنگھرو، لوک لاج تج ناچی
میراں شری گردھر لال سوں بھگتی رسیلی جانچی
ہے ری، میں تو دردِ دیوانی، مورا درد نہ جانے کوئے
گھائل کی گتی گھائل جانے، کی جن لائی ہوئے
جوہر کی گت جوہری جانے، کی جن جوہر ہوئے
سولی اوپر سیج ہماری، سوؤں کس بدھ ہوئے

ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو گیت کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اردو گیتوں کی ترویج کے سلسلے میں ابوالاثر حفیظ، ساغر، تاثیر، میراجی، اندرجیت شرما، آرزو لکھنوی، قیوم نظر، حفیظ ہوشیارپوری، مجروح سلطانپوری، ضیا فتح آبادی، امرچند قیس، مقبول حسین احمدپوری، وقار انبالوی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن جدید اردو شعرا میں سب سے پہلے گیت کتابی صورت میں ضیا فتح آبادی نے پیش کیے۔

گیت عورت کے جسم کا اظہار ہے، اس کے دل کی پکار ہے، اور رمز و ایما نسوانیت کی مرزت۔ اردو گیت کاروں کی اکثریت نے یہی نصب العین سامنے رکھ کر گیت رچے ہیں۔

زندگی امید پر قائم ہے۔ یہی امید انسان کو جینے پر اکساتی ہے۔ اگر زندگی ناامیدی کے اندھیرے دل میں بھٹکتی رہے، تو کسی کو جینے کی تمنا نہ رہے۔ اسی لیے ضیا صاحب فرماتے ہیں:

جیون ساگر ٹھاٹھیں مارے
گھور اندھیرا دور کنارے
من کی نیا پریم سہارے۔ پیا ملن کی آس لگی ہے پیا ملن کی آس

کوئی پھول چڑھانے آئی
کوئی گیت سنانے آئی
میں بھی پریم جتانے آئی

پریم ہی میرے پاس
سکھی ری، پیا ملن کی آس

پریم کی جوت جرے جس من میں
وہ من بھی رہتا ہے تن میں
کوئل کوک رہی ہے بن میں

پھولوں میں ہے باس
سکھی ری، پیا ملن کی آس

کیونکر روؤں، شور مچاؤں
پریمی منوا کو بہلاؤں
ان کے نینن سے گر جاؤں

ہو رکھ ہوت اداس
سکھی ری، پیا ملن کی آس

عام طور پر گیتوں میں کسی الھڑ عورت کے جذبات ہوتے ہیں، جن میں پختگی کا شائبہ نہیں ہوتا۔ "جس تن لاگے سوئی جانے" والی بات ہے۔ اس کا احساس صرف اسی کو ہوتا ہے، جس کے من پر چوٹ لگتی ہے، اور پھر جذبات خود بخود پکار بن کر ابھرنے لگتے ہیں، سندیسے بن کر پھیلنے لگتے ہیں۔ سندیس لے جانے کو کاگا ہو یا کوئل، بادل ہو یا کوئی سہیلی، یا اختر شیرانی کا ننھا پیامی ۔۔۔ عورت اپنا حسن، اپنی آواز، اپنے جسم کا لوچ اور درد سب کچھ گیت کی مالا میں پرو دیتی ہے، اور پھر انتظار کرنے لگتی ہے اپنے اس پردیسی کا، جو وعدہ کرکے ابھی نہیں لوٹا اور جدائی میں، تنہائی میں چپکے سے کہتی ہے:

پی کے گیت، مدھر، من موہن
ان سے اجیارا جگ جیون
یہ ہیں پریم کا سندر درپن

پی کے گیت سنا
پپیہے، پی کے گیت سنا

کس سے کہوں میں من کے دکھڑے!
پی پردیس میں جا کر بھولے
لیکن میں بھولوں گی کیسے

تو ہی مجھے بتا
پپیہے، پی کے گیت سنا

میں کبھی پاپن، تو بھی پاپی
پریم کے ہم دونوں ہیں پجاری
من میں لگی ہے آگ برہ کی

اور اسے بھڑکا
پپیہے، پی کے گیت سنا

طویل مسافت سے گھبرائی ہوئی محبوبہ پپیہے سے التجا کرتی ہے کہ اگر کوئی دوسرا اس ہجر میں میری مدد نہیں کر سکتا، تو تو ہی آ اور اپنے مدھر سُر میں گیت سنا، اس کے پریم کے، تاکہ من سے پریم کی اگنی بجھنے نہ پائے۔ دونوں ایک ہی بان کے گھائل ہیں، اس لیے دونوں مل کر جدائی کی گھڑیاں کاٹنے کے لیے ایک دوسرے کے جلیس رہیں۔

ضیا کبھی پریت کرنے کے لیے کہتے ہیں، تو من میں پیار کے اچھے پہلو اجاگر کرتے ہیں، بنجر من میں پریم کے پھول کھلاتے ہیں۔ پھر ان کو خوشبو سے مہکاتے ہیں:

آؤ، ہم تم پریت کریں

پریم ہی جیون جوت ہے، پیارے!
پریم سے روشن چاند ستارے
پریم کو اپنے من میں بسا کر
جیون سپھل کریں
آؤ، ہم تم پریت کریں
ہم ہوں، تم ہو، ہوں پیار کی باتیں
اپنے دن ہوں، اپنی راتیں
جیون کے اس بھید کو پا کر
مرنے سے نڈر ہیں
آؤ، ہم تم پریت کریں
چھائی ہوں گھنگھور گھٹائیں
نیا طوفاں میں لے جائیں
سب دنیا کی آنکھ بچا کر
دونوں ڈوب مریں آؤ، ہم تم پریت کریں

اس گیت کے پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ ضیا صاحب کے من میں تذبذب کا عنصر ہے۔ ایک طرف تو کہتے ہیں کہ پریم کو من میں بسا کر جیون کو کامیاب بنائیں اور دوسری طرف اس گیت میں جرأت کی ترغیب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اور پھر اتنے کامیاب پریم جیون کو وہ ڈوب کر ختم کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

نفسِ مضمون کے علاوہ گیت کی جان اس کے ترنم میں ہے۔ ضیا کے گیت، موسیقی اور سراپا نگاری کا خوبصورت نمونہ ہیں۔ اردو شاعری میں اظہارِ محبت کے لیے مردوں کی طرف سے بھی گیت لکھے گئے ہیں جن میں عورت کے حسن و شباب اور ناز و ادا کا ذکر ہے۔ مثلاً مطلبی فرید آبادی نے جنگِ آزادی

کے لیے دیہاتوں میں گیت گائے ہیں۔ عظمت اللہ کے ہاں یہ نسوانی رنگ روپ کی تعریف کے لیے آئے ہیں :

ہائے، وہ صورت پیاری پیاری
بڑی بڑی آنکھیں کالی
چکنے چکنے بال بھی کالے

ستھری، سنھری میٹھی میٹھی
بانسری کی سی آواز
نفیس چڑھاؤ، نفیس اتار

سندر صورت، دل میں سمائے
دل کو بھائے دل میں آئے
تجھ بن جگ ہو خالی خالی

قتیل شفائی کے ہاں یہ گیت دُھن میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہی دُھن کا احساس ضیا کے گیتوں میں بھی ملتا ہے :

برکھا میں خوش نر اور ناری
برکھا سب کو من سے پیاری
ڈالی ڈالی، کیاری کیاری

جوبن پر اترائی
سجنی، برکھا کی رت آئی

آم کے پیڑ پہ کوئل بولے
دوار پریم مندر کے کھولے
تو بھی سجنی پریم کی ہو لے

میں کیسی ہوں سودائی
سجنی، برکھا رت آئی

کہیں مرد کی طرف سے محبت کی یہ دعوت اندھیرے اور بجھے ہوئے من میں پیار کی آگ دوبارہ جلاتی ہے۔ کہیں وہ پکار بن کر اپنے بالم کو پکارتی ہے: "بالم! آ بھی جاؤ۔" کہیں الجھن کا روپ دھارن کر کے وہ کہتے ہیں:

مایا جال میں پھنس کر دنیا بھولی پریم کہانی
الٹی گنگا بہتی ہے، اب اگیانی ہے گیانی
کس سے کہوں میں من کا دکھڑا، کون سنے یہ باتیں!
کون سنے یہ باتیں، سجنی! کون سنے یہ باتیں!

سُندر سپنے دیکھ رہے ہیں سورج چاند ستارے
مست ہیں اپنی اپنی دُھن میں، دھرتی کے متوارے
اپنے اپنے دن ہیں سب کے، اپنی اپنی راتیں
کون سنے یہ باتیں، سجنی! کون سنے یہ باتیں!

ضیا نے گیتوں میں تین نئے موضوع 'دوشا'، 'جواری' اور 'ہنسی' میں اپنائے ہیں، جن سے ان گیتوں میں وسعت پیدا ہوگئی اور موضوعات کی یک رنگی ٹوٹی ہے۔ ضیا صاحب نے عورت کی پکار کی جگہ، انسان کی پکار کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے:

ہنسی

آج ہنسونگا
ہنسنے دو، میں آج ہنسونگا
ہنس کر ہنس کر، دنیا میں جیونگا
پریم کی مُدرا آج پیونگا
آج پیونگا، آج جیونگا
آج ہنسونگا
ہنسنے دو، میں آج ہنسونگا

میں کیوں روؤں، نیر بہاؤں
آشاؤں میں آگ لگاؤں

رونے کا میں نام نہ لونگا
آج ہنسونگا
ہنسنے دو، میں آج ہنسونگا

کلیاں کھِل کر، پھول بنی ہیں
غم کی باتیں بھول گئی ہیں

میں بھی اپنا دُکھ بھُولونگا
آج ہنسونگا
ہنسنے دو، میں آج ہنسونگا

موضوع دکھی انسان کو امید کی کرن دکھاتا ہے۔ ایک معمولی پریمی کے روپ میں دکھی انسان ہے۔ درد کا شکار آدمی غالب کا یہ شعر پڑھ پڑھ کر تسکین حاصل کرتا رہا ہے :

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

ضیا نے اس گیت میں علامتی رنگ میں دکھی انسان کو اپنے دکھوں سے لڑنے کا سبق دیا ہے۔ یہی انداز "جواری" میں ہے۔ "ادشا" میں وہ بنبد کے ماتوں کو جگاتے ہیں۔ ضیا صاحب کے گیت اردو گیتوں کی ان تمام روایتوں کے حامل ہیں، جن پر اردو شاعری فخر کر سکتی ہے۔ ان میں اختر شیرانی کے گیتوں کی حلاوت ہے، حفیظ جالندھری کے گیتوں کی سپردگی، میراجی کے گیتوں کی جدت اور حسین الفاظ کا انتخاب ہے۔ ان میں رس ہے، لوچ ہے، سادگی ہے، الھڑپن ہے، بے ساختگی ہے۔ ان میں بناوٹ کا شائبہ نہیں۔ یہ دل سے نکلی ہوئی پکار، من کی دُبدا کا اظہار، پورا درد لیے ہوئے ہیں۔

ریوتی سرن شرما

ضیا فتح آبادی کی شاعری

ضیا صاحب سے میری ملاقات حلقۂ اربابِ ذوق کی ایک مجلس میں ہوئی۔ یہ تقسیمِ ہند کے دنوں کی بات ہے۔ تہذیبی اور ادبی اداروں کا شیرازہ بکھر گیا تھا اور صاحبِ ذوق حضرات ایک جگہ سے اجڑ کر دوسری جگہ ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ جو لوگ اس طوفان کی یورش سے بچ گئے تھے، وہ بڑی شد و مد سے ادبی سرگرمیاں شروع کرنے کے لیے نئے اور پرانے اراکین کو یکجا کرتے پھر رہے تھے۔ دلی کالج میں حلقۂ اربابِ ذوق کی مجلسوں کا سلسلہ پھر سے شروع کیا گیا اور جن چند اصحاب نے اس کے از سرِ نو قیام میں دلچسپی لی، ان میں ضیا صاحب بھی تھے۔ ضیا صاحب باقاعدگی سے ان مجلسوں میں شریک ہوتے اور اپنے کلام سے مجلس کے پروگراموں کو رنگین بناتے تھے۔ انھیں مجلسوں میں مجھے ان کے کلام سے رُوشناس ہونے کا موقع ملا۔

میں نے ضیا صاحب کے کلام اور ان کی ذات میں ایک خاص مناسبت پائی ہے۔ خیالات اور جذبات کی جو پاکیزگی ان کی شخصیت کا خاصہ ہے، وہی ان کے کلام میں اُتر آئی ہے۔ مواد اور ہیئت دونوں اعتبار سے ان کی شاعری بڑی پاکیزہ ہے، جس کا قارئین پہ بڑا صحت مند اثر ہوتا ہے۔ زبان بڑی شستہ

اور پاکیزہ ہے۔ لیکن ان کی زبان میں وہ روکھا پھیکا پن نہیں، جو اکثر پاکیزگی سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان کو جذبات میں ڈبو کر موضوع کے مطابق کہیں رنگین اور کہیں پُرشکوہ بنا لیا ہے۔ جب وہ قطعات میں مجلسی واردات بیان کرتے ہیں، تو ان کی زبان میں وہ لوچ اور وہ سوز اور وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو دل پر سیدھا اثر کرتی ہے:

جھٹپٹا وقت، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا   آسمان پر خرام بادل کا
جان و دل کو خریدے لیتی ہے   ایسے عالم میں، بانسری کی صدا

لیکن جب وہ انسان کو جاگنے کی ترغیب دیتے ہیں، تو ان کے الفاظ میں بجلی جیسی کڑک اور گھن گرج پیدا ہو جاتی ہے:

نظمِ رنگ و بو بدل   بادہ و سُبو بدل
وقت کی پکار سُن   بے درنگ تو بدل
آفتاب آگیا   انقلاب آگیا
اب ہے امتحاں کا جاگ   جاگ، اے انسان جاگ

ضیا صاحب کسی سیاسی پارٹی کے ڈھنڈورچی نہیں۔ پھر بھی انھوں نے انسان کی بیداری، اس کی آزادی، اور اس کی نجات کے لیے آواز اٹھائی ہے۔ انسان کو بیعمل اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑا دیکھ کر ان کا دل رو اٹھتا ہے:

جب جہاں محوِ خواب ہوتا ہے   بیچ کر عقل و ہوش سوتا ہے
موت دنیا پہ دیکھ کر طاری   میں بھی روتا ہوں، دل بھی روتا ہے

لیکن ان کی آواز آنسوؤں میں گھُٹ کر نہیں رہ جاتی۔ انھیں اپنے ارادوں کی بلندی اور قوتوں کی بیداری کا احساس ہے۔ اس لیے وہ کہہ اٹھتے ہیں:

بیدار میری سوئی ہوئی قوتیں ہیں آج
رُخ سیلِ حادثاتِ زمانہ کا موڑ دوں

اور بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ ہر اس طاقت سے ٹکر لینے پر تیار ہو جاتے

ہیں، جو انسان کی بیداری اور اس کے ترقی کی راہ پر گامزن ہونے سے روکتی ہے۔ اس معاملے میں وہ انسان تو انسان، خدا سے بھی منحرف ہو جانے کو تیار ہیں:

طوفاں کو اپنے عزم کے ہاتھوں سے دوں شکست
چھوڑا ہے ناخدا کو، خدا کو بھی چھوڑ دوں
آج میں تجھ سے بغاوت پہ اتر آیا ہوں
میرا معبود کوئی ہے، تو ہے لیلائے حیات
میں تجھے آج بھلا ہی دونگا
نام ترا سحر و شام لیا ہے میں نے
میں نے پوجے ہیں بنا کر ترے بتہائے حسین
تجھ کو نذرانۂ صد ہوش دیا ہے میں نے
میں تجھے آج بھلا ہی دونگا

ضیا کے اشعار میں غمِ جاں کا رونا کم اور غمِ دوراں کا اظہار زیادہ ہے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ضیا نے شاعری کے دل کو اپنے غم سے نہیں، بلکہ انسانیت کے درد سے دھڑکایا ہے۔ اس نے اپنی زندگی کی شام کو روشن کرنے کی کوشش نہیں کی، انسانیت کی وسیع و عریض محراب کو منوّر کرنے کے لیے اشعار کی کرنیں پھینکی ہیں۔ یہ کرنیں کمزور ہو سکتی ہیں، کم ہو سکتی ہیں، لیکن یہ کرنیں ہیں روشنی کی کرنیں، ظلم، بے انصافی، گمراہی کے اندھیروں کی دشمن!
اور جو ادیب کرنوں کو جنم دیتا ہے، رات کی تاریکی کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ ادب کا بہت بڑا تقاضا پورا کرتا ہے۔
لیجیے! ایک غزل کے کچھ اشعار سنیے

تم چلے آئے تو ساری بیکلی جاتی رہی
زندگی میں تھی جو یک گونہ کمی، جاتی رہی

ان سے ہم، اور ہم سے وہ، کچھ اس طرح گھل مل گئے
وہ ملاقاتوں میں سب بیگانگی جاتی رہی
وہ تو رخصت ہو گئے، چھا کر دماغ و قلب پر
یاد ان کی دم بدم آتی رہی، جاتی رہی

ضیا کی شاعری نے وقت کے ساتھ ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ انھوں نے اپنے مقررہ معیار سے انحراف نہیں کیا، بلکہ عروسِ سخن کو نکھارا، سنوارا اور اُبھارا ہے۔ ان کی تازہ ترین تخلیقات اس بات کی گواہ ہیں۔ "گردِ راہ" اور دھوپ اور چاندنی" سے صرف چند اشعار پیش کرونگا، جس سے آپ اندازہ کر سکینگے کہ ضیا کی شاعری نے کبھی ندرت، جدّت اور رفعتِ بلندی کا دامن نہیں چھوڑا، وہ وقت کے تقاضوں کو بطریقِ احسن پورا کرتی رہی ہے:

در و دیوارِ قفس پر ہیں لہو کے چھینٹے مرغِ پر بستہ کو شوقِ چمن آرائی تھا
کوئی انساں، نہ انسانوں کی بستی ہیں ملا کوئی ہندو، کوئی مسلم، کوئی عیسائی تھا

ہم جو ناکام ہیں، تو کیا غم ہے! امتحاں کامیاب ہے، پیارے!
آ گیا ہوں توڑ کر زندانِ جسم اب بتا، اے زندگی! کیسا لگا

وطن کی یاد ستاتی ہے اب تو غربت میں یہ تم سے کس نے کہا تھا، وطن سے بھاگ چلو
نیا زمانہ، نئی روشنی، نئے دستور قدیم رسم و رواجِ کہن سے بھاگ چلو
بٹھائے جاتے ہیں پہرے زبانِ حق گو پر غلط سیاستِ دار و رسن سے بھاگ چلو

جلتی رہیں امید کی شمعیں تمام رات مایوس دل ہیں کچھ تو ضیا! روشنی رہی

صبح نے روشن تیر چلائے شب کا درپن ٹوٹا جائے
اس انساں کا جینا ہی کیا! جو انسان کے کام نہ آئے
ہر ذرّے میں سورج روشن دھرتی سے آکاش ... جائے

ضیا کی شاعری میں نور کی کرنیں مدھم نہیں ہوئیں۔ وہ غمِ انساں کے پیکرِ دکھاتا ہے، ان کے غموں کا مداوا بتاتا ہے۔ اس کے پاس خیال بھی ہیں اور بیان کی بے پناہ صلاحیت بھی۔ یہی اس کی شاعری کی کامیابی اور حسن کی دلالت ہیں۔

ضیائے کلام

(انتخاب)

کافر بنا دیا کہ مسلماں بنا دیا
فطرت کا شکر کر، تجھے انساں بنا دیا

خون روتا ہوں کہ انساں بھی نہیں ہے انساں
کیا بڑی بات تھی، انساں اگر انساں ہوتا

کشتی ساحل پہ ڈوبی ہے
موجیں ہوتیں، دریا ہوتا!

فصلِ خزاں جو آئی، تو مرجھا کے رہ گئے
پھولوں کو اپنے حسن پہ کتنا غرور تھا

روشِ میکدہ بدل دیتا
کوئی ایسا نہ ہوشیار آیا

اس نے بھلا دیا تجھے، تھی یہ بھی مصلحت
لیکن تو اس کو بھول گیا، یہ برا ہوا

گمرہی میں ہے ایک لطف، ضیا!
جاؤ میں راہ پر نہیں آتا

جس نے سمجھ لیا کہ زیست نام ہے اضطراب کا
اس کو سکون مل گیا، گردشِ روزگار سے

مجھے دیوانگی کا درس دے کر
خفا کیوں ہو، مرے دیوانہ پن سے

رونا اس بات پہ آتا ہے کہ سوچا کیا تھا
اور اس بات پہ ہنستا ہوں کہ ہوتا کیا ہے

منزل سے بے نیاز رہیں اہلِ کارواں
یہ فرضِ کارواں ہے کہ ہر دم رواں رہے

آیا نہ شاخِ گل پہ کبھی بلبلوں کو چین
گل ہیں کہ نوکِ خار پہ بھی شادماں رہے

طے کر چکا ہوں منزلیں آغازِ شوق کی — اب انتظار ہے، نہ شبِ انتظار ہے

زندگی ہے بذاتِ خود اک موت — موت کا انتظار کون کرے!

کون پامالِ روزگار نہیں — شکوۂ روزگار کون کرے!

ہماری نا امیدی میں بھی ہے امید کا پہلو — کہ ہستی رائیگاں سے ہم ہیں، ہستی رائیگاں ہم سے

چاند بھی کہہ کے چھپ گیا، شمع بھی کہہ کے بجھ گئی
حسنِ ازل کی داستاں، قصۂ ناتمام ہے
دل جو نہیں، تو غم نہیں، غم جو نہیں، تو کچھ نہیں
زیست مجھے وبال ہے، ورنہ مجھے حرام ہے

حیاتِ تازہ کے نغموں سے گونجتی ہے فضا — نئی امنگ، نئی کروٹیں بدلتی ہے

سکوتِ یاس کے لب پہ ہے نغمۂ امید — کرن سحر کی، شبِ تار ہی میں پلتی ہے

سکوں پذیر بہت ہے [illegible] جانِ حزیں — نقاب رخ سے الٹ دو، نظر سنبھلتی ہے

پوچھتے ہیں وہ کہ غم کیا چیز ہے — خود نہیں سمجھے، انھیں سمجھائیں کیا!

تم چلے آئے، تو ساری بیکلی جاتی رہی — زندگی میں تھی جو یک گونہ کمی، جاتی رہی

وہ تو رخصت ہو گئے، چھا کر دماغ و قلب پر — یاد ان کی دم بدم آتی رہی، جاتی رہی

محبت کو تم ہی کہو، میں کہوں کیا! — اسی نے ڈبویا، اسی نے ابھارا

ترا شکریہ، اے فریبِ محبت! — تمناؤں میں مجھ کو الجھا کے مارا

میری خلوت میں ترے حسن کی یاد — آ نہ سکتی تھی، مگر آتی ہے

تیری صورت میں اب اے دوست مجھے — اپنی صورت ہی نظر آتی ہے

غمِ عشرت ہو کہ ہو عشرتِ غم — آنکھ ہر بات پہ بھر آتی ہے

موت کے روپ میں ہر بار، خدایا! — نئی ہستی کی خبر آتی ہے

پروانہ جل کے راکھ ہوا، شعلۂ حیات — مغموم و سوگوار نہ تھا، دیکھتے رہے

تم پریت نبھاؤ تو جیا نیں — ورنہ باتیں ہی باتیں ہیں
سلجھا نہ سکے گی عقل انھیں — الجھی ہوئی دل کی باتیں ہیں

امواج پہ لرزہ طاری ہے، گرداب میں ہلچل پیدا ہے
ساحل کی تمنا کون کرے: اب زورِ طوفاں دیکھینگے
آزاد فضاؤں میں جا کر نکلے، ہم بھی محوِ پرواز اک دن
اجڑا ہوا زنداں دیکھینگے، آباد گلستاں دیکھینگے
تاروں کی چمک، کلیوں کی چٹک، موجوں کا ترنم، حسنِ جواں
ہم تجھ کو ضیا! اس عالم میں مدہوش و غزلخواں دیکھینگے

عالمِ وجد و بیخودی میں تجھے
ہم نے آواز بارہا دی ہے
اے زمین! ہم نے تیرے قدموں پر
آسماں کی جبیں جھکا دی ہے
کوششِ امن تو بجا، لیکن
آدمی فطرتاً فسادی ہے
اے خدا! تو نے اپنے بندوں کو
زندگی کی کڑی سزا دی ہے
اے ضیا! قلب عشق پرور میں
حسن نے آگ سی لگا دی ہے

جنت کھو کر دنیا پائی
دیکھی انسان کی چترائی
غم کی دولت پا کر خوش ہیں
عشق و محبت کے سودائی
بیٹھ گئے منزل کو پا کر
ہم نے جہاں بھی ٹھوکر کھائی
آگ سے کھیلا، لپکا، بہکا
پروانے نے جان گنوائی

اے دلِ دردآشنا! اجڑی ہوئی بہار دیکھ
باغ خزاں شکار میں، پھول نہیں، تو خار دیکھ
تو نے کہا تھا: زندگی صرف فریبِ ہوش ہے
مجھ کو جہانِ زیست پر آ گیا اعتبار، دیکھ
کیا ہے مآلِ ذوقِ عشق، حسن کی کائنات میں
اے دلِ بیقرار! سوچ، دیدۂ اشکبار! دیکھ
گلکدۂ حیات میں آج خزاں کا راج ہے
اس کی طرف بھی گاہ گاہ، فتنہ گرِ بہار! دیکھ

تیرے بغیر زندگی تشنگی دوام ہے
روح بھی بیقرار ہے، دل بھی ہے سوگوار دیکھ

آ ہی گیا فریب میں حسن کے تو بھی، اے ضیا!
سجدے میں ہے سرِ نیاز، اپنا مآلِ کار دیکھ

باقی اک رہ جائیگا نقشِ ضیائے الفت کا
دنیا بھی مٹ جائیگی اور ہم بھی مٹ جائینگے

کمالِ ضبط میں آنسو نکل آتے ہیں آنکھوں سے
نظامِ کائناتِ عشق برہم یوں بھی ہوتا ہے

امیدیں جاں بلب، کچلی ہوئی دل کی تمنائیں
میں ہنستا ہوں کہ اک اندازِ ماتم یوں بھی ہوتا ہے

نکلتا ہے جو آنکھوں سے ترے دردِ جدائی میں
چمکتا ہے وہ آنسو بن کے شبنم، یوں بھی ہوتا ہے

غم سے نجات کیا ملے، غم سے جو نہیں تو کچھ نہیں
دل کی تڑپ حقیقتاً حاصلِ کائنات ہے

نورِ حیات تجھ سے ہے، کیفِ حیات تجھ سے ہے
دن ہے نہ دن ترے بغیر، اور نہ رات رات ہے

درسِ جنوں ہے کم ہی، خضر کی بات پر نہ جا
موت قیام کا ہے نام، اور سفر حیات ہے

چاند نے جگمگا دیا، شمع نے گنگنا دیا
عشق نہیں، تو زندگی ایک اندھیری رات ہے

حسن زیبِ ذوقِ دید، عشق طلسمِ سوز و ساز
حسن نہیں ہے پائدار، عشق بھی بے ثبات ہے

ان کو بنایا من ادھیکاری میں نے جیتی بازی ہاری

پریم کی بازی میں نے اکثر
ہار کے جیتی جیت کے ہاری

عشق میں گھاٹا ہی گھاٹا ہے
پھر بھی دنیا ہے بیوپاری

دامنِ ضبط میں سکوں پایا
شورشِ شیریں سے جب نجات بھی

جسم کا سب طلسم ٹوٹ گیا
جب ادا دوں کا کائنات بھی

نہیں شام و سحر کے درمیاں دل شاد کام اپنا
ابھی کا نام دنیا ہے، تو دنیا کو سلام اپنا

وقارِ ضبط کیسا! ہمتِ ایذا طلب کیسی!
وفاؤں میں الجھ کر رہ گیا ہے ذوقِ خام اپنا

کبھی مندر، کبھی مسجد میں مصروفِ پرستش ہے
نہیں پایا ابھی تک تیرے بندے نے مقام اپنا

منزلِ مقصود ہوتی ہے قریب
راستے سے جب بھٹک جاتا ہوں میں

پیدا ہوتی ہے صبح تب سازِ حیات
وہ جہاں آ کر غزل گاتا ہوں میں

راہ کے پیچ و خم وہ کیا جانے!
جس نے کھائی نہیں کبھی ٹھوکر

ہزاروں پیچ و خم ہر گام پہ ملتے ہیں راہِ ہستی میں
محبت کو نہ میں اپنا بنا لیتا، تو کیا ہوتا!

مجھے محبت کا سوز دے دے، یہ اپنوں کا جلال لے لے
حرارتِ خونِ آرزو ہے، شرار لے کر میں کیا کروں گا

طویل راتوں کی ظلمتوں میں ضیا! میں اکثر یہ سوچتا ہوں
گراں ہے بارِ غمِ محبت، یہ بار لے کر میں کیا کروں گا!

جو جینا ہے، تو جینے کی طرح جی
بھروسا زندگی میں موت کا کیا!

پوچھ ضیا! یہ اہلِ دل سے
پیار نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

اے ذوقِ طلب! اے پاسِ وفا! اے لذتِ غم! اے مجبوری!
سمجھا نہ مرے دل نے اب تک، اس درد کا درماں کیا ہوگا

آؤ تو ذرا یہ پوچھ ہی لیں، ہر روز بدلتی قدروں سے
انساں نہ ملیگا جب کوئی، وہ عالمِ انساں کیا ہوگا!
دریائے جنوں میں ہر دل ہر دم، ہچکولے کھاتا رہتا ہے
کشتی نہ ابھی تک ڈوب سکی، اے موجۂ طوفاں کیا ہوگا!
دل کی رگ رگ میں رواں تھا جن سے خونِ زندگی
ان تمناؤں کو، چاہوں کو نہ جانے کیا ہوا

ان سے ہیں دور رہوا، خوب ہوا آگئے وہ مرے نزدیک بہت
غمِ جاناں مرے دل سے نہ گیا کی غمِ دہر نے تحریک بہت
نہ جنت، نہ دوزخ، نہ ہے دین و دنیا بتا، اے محبت! کہاں آگئے ہم؟
عجب دائرہ ہے محبت کی دنیا چلے تھے جہاں سے، وہیں آگئے ہم
محبت کی یہ محویت، کیا کہوں! وہ آئے، تو اپنی خبر کچھ نہیں
محبت ہے انساں کی آبرو بغیرِ محبت، بشر کچھ نہیں

ختم عہدِ قیصر و فغفور کی باتیں کریں
دورِ جمہوری ہے یہ، جمہور کی باتیں کریں
حوصلوں کو ہے ابھی قربانیوں کی احتیاج
دار کا چرچا کریں، منصور کی باتیں کریں
ہم کو کرنی ہے مرتب داستانِ حسن و عشق
صبحِ دلی، شامِ نیشاپور کی باتیں کریں

فردا کی فکر، حال کا غم، اضطرابِ شوق دیوانے تنگ دہر کی محفل سے آئے ہیں
دے تو چکے تھے پاؤں جواب، اے ضیا! مگر منزل تک اپنے حوصلۂ دل سے آئے ہیں

مل ہی جائیگی منزل کہیں جادہ پیما رہے کارواں
کہہ سکا میں، نہ وہ سن سکے غم میں ڈوبی ہوئی داستاں
دشمنی کو، ضیا! مل گئی سایۂ دوستی میں اماں

خدا جانے امیرِ کارواں کے دل پہ کیا گذری
نہ وہ راہوں کے قصے ہیں، نہ وہ منزل کی باتیں ہیں

محبت، آرزو، آنسو، تبسم، حوصلہ، کوشش
فرشتے کچھ نہ سمجھیں گے، یہ مُشتِ گِل کی باتیں ہیں

رہِ پرخار و بادِ تند و ہیبت ناک خاموشی
دلِ ناداں! یہی تو قربتِ منزل کی باتیں ہیں

نئے رہرو، نئی منزل، نیا دل
نئی راہیں دکھانا چاہتا ہو دل

ہزار بار ہی دیکھا ہے سوچنے کا مآل
ہزار بار ہی سوچا ہے: دیکھیے کیا ہو!

صبح نے روشن تیر چلائے
شب کا درپن ٹوٹا جائے

مجھ کو بلائے وہ دیوانہ دل
اشکوں سے جو آگ بجھائے

ماتھے پہ بندیا کا سورج
آنکھوں میں کاجل کے سائے

بادل جھومے نیل گگن پر
گوری نے گیسو لہرائے

کوئی لگائے آگ دلوں میں
کوئی دلوں کی آگ بجھائے

اس انساں کا جینا ہی کیا
جو انساں کے کام نہ آئے

مجبورِ غمِ دنیا، دل سے تو کوئی پوچھے
احساس کی رگ میں ہے خارِ غمِ جاناں بھی

بغض و حسد، نفرت، ناکامی و محرومی
انسانوں کی بستی میں، کیا ہے کوئی انساں بھی

غمِ دنیا و دیں ان کو، نہ فکرِ نیک و بداں کو
محبت کرنے والے بے نیازِ بخشش و کرم نکلے

منزلوں کے متلاشی! غم سے کیوں گریزاں ہے
تیرگی کے پردے میں روشنی کا ساماں ہے

انھیں بے مہروں سے کیا شکوہ
گمرہی کا بھرم نہ کھل جائے

دنیا مری نظر سے تجھے دیکھتی رہی
پھر میرے دیکھنے میں بتا کیا کمی رہی

کیا غم، اگر قرار و سکوں کی کمی رہی
خوش ہوں کہ کامیاب مری زندگی رہی

آئی بہار، جام چلے، مے لٹی، مگر
جو تشنگی تھی مجھ کو، وہی تشنگی رہی

اک درد تھا جگر میں، جو اٹھتا رہا مدام
اک آگ تھی کہ دل میں برابر لگی رہی

دامن دریدہ، لب پہ فغاں، آنکھ خونچکاں
گر کر تری نظر سے مری بیکسی رہی

جواں ہے ہمت، ہے عزم محکم، نظر اٹھا، ہیں تو اہلِ دانش
الم کے تاریک افق پہ روشن شعاعِ امید بھی ملیگی

کہہ دیا ان سے، جو نہ کہنا تھا
اور کہنا جو تھا، وہ کہہ نہ سکے

زندگی کے ہزاروں وار سہے
موت کا ایک وار سہہ نہ سکے

وہ بھی کیا قربتِ محبت تھی
دور رہ کر بھی دور رہ نہ سکے

آزمایش اگر جفا سے نہ ہو
امتحانِ وفا نہیں کچھ بھی

وادیِ غم میں لا کے چھوڑ دیا
اب کھلا، راہنما نہیں کچھ بھی

ہوش ہوتا ہے، نہ کچھ اپنی خبر ہوتی ہے
ہائے، کیا چیز محبت کی نظر ہوتی ہے

ابر ہو، سایہ فگن، یا کہ جھلستی ہوئی دھوپ
زندگی اپنی بہرحال بسر ہوتی ہے

یقیں کے پاؤں میں لغزش نہ آئے
بدل جاتی ہیں تقدیریں یقیں سے

ماضی کی مجھ کو فکر، نہ فردا کا کوئی غم
سر چڑھ کے بولتا ہے، یہ جادو ہے حال کا

ہوتے ہیں پھر طلوع مہ و مہر جام سے
پرتو پڑا ہے کیا عرقِ انفعال کا!

یہ شب کی تیرگی، یہ المناک خامشی
اچھا ملا جواب ہمارے سوال کا!

دنیا گنوائی، دین بھی کھویا، ملا نہ کچھ
انجامِ کار دیکھ لیا دیکھ بھال کا!

جن کے لیے دنیا ہے مجبورِ وفاؤں پر
یارب! کبھی ان کو بھی احساسِ وفا ہوگا!

کھولوں گا میں جب آنکھیں آغوشِ محبت میں
دنیا ہی نئی ہوگی، عالم ہی نیا ہوگا

کرنوں سے سنواریگا جب چاند گلستاں کو
بربط پہ جوانی کے دل نغمہ سرا ہوگا

افسانۂ غم میرا کانٹوں کی زباں پر ہے
کلیوں نے سنا ہوگا، دل تھام لیا ہوگا

عشرت کی دعا مانگی، اور دولتِ غم پائی
سوچا تھا، ضیا! میں نے، میرا بھی خدا ہوگا

ولولوں کے چہچہے، حوصلوں کے قہقہے
کیا پیامِ موسمِ نوبہار آگیا!

اب تو چھیڑو کوئی گیت سازِ موج پر – قید آبشار تھی، آبشار آگیا!

زباں پر آج ہے شکوہ گلا کیا – ترے بندوں کو یارب ہو گیا کیا!

زمانے میں کوئی کس کا ہوا ہے! – زمانے میں کسی کا آسرا کیا!

مری ناکامیوں، بربادیوں میں – تمہارا ہاتھ بھی شامل نہ تھا کیا!

دل دیا، درد لیا، ہوش سے بیگانہ ہوا – لوگ اڑاتے ہیں مذاق آپ کے دیوانے کا

غمِ زندگی یا غمِ بندگی ہو – ہمارا مقدر لہو دل کا پینا

انسانیت کا نام بھی لینا گناہ ہے – جیسے کوئی زمانے میں انساں نہیں رہا

گل سینہ چاک، بلبلیں چپ، آشیاں اداس – تم کیا گئے، بہار کا ساماں نہیں رہا

کرشمہ سازیِ اہلِ خرد کو دیکھتا ہوں – میرے جنوں میں کمی آگئی، تو کیا ہوگا!

ہیں دو چار ہی بس انہیں تعبیروں سے دنیا مانوس

نظر فریبِ سحر کھا گئی، تو کیا ہوگا!

ان کے آتے ہی درد بھول گیا – واہ رے میرے قلبِ خانہ خراب!

داستاں غیروں کی کہتے کہتے – کہہ گیا کوئی ترے پیار کی بات

وہ آتے نہیں، وہ آتے ہیں، شب بھر – دیتے دھوکا مجھ کو تاروں کی آہٹ

کبھی زندگی آدمی پہ فدا تھی – فدا آدمی آج ہے زندگی پر

اے میرے دلِ ناکام! سنبھل، ناامید نہ ہو، مایوس نہ ہو

امید پہ دنیا قائم ہے، امید نہیں، تو کچھ بھی نہیں

منزل کی لگن دل میں ہو اگر، رستے بھی خراماں ہوتے ہیں

شمعوں کی طرف اٹھتے ہیں قدم، ظلمت سے گریزاں ہوتے ہیں

جن پر انساں ایمان لائے، دین و دنیا منکر جن سے

ایسے بھی کافر ملتے ہیں، ایسے بھی مسلماں ہوتے ہیں

کامراں ہوں نہ ہوں، ضیا! لیکن – آرزو کا فریب کھائیں گے

پردے اٹھا رہا ہوں تری ذات سے مگر – خود میری ذات کیا ہے، مجھے کچھ خبر نہیں

تدبیرِ زندگی پہ بھروسا ہے، اے ضیا! قسمت کی بات کیا ہے، مجھے کچھ خبر نہیں

ڈرتا ہوں آگہی سے، کہیں ٹوٹ ہی نہ جائے شام و سحر کے بیچ اہم جو کڑی ہے رات

تم ملے تو خوشی ملی، ورنہ میں تو سمجھا تھا غم ہی میرا ہے

گھر جلا کر ہی روشنی کر لیں ہر گلی، کوچے میں اندھیرا ہے

میں ہی دریا، میں ہی ساحل، میں ہی طوفاں، میں ہی موج

بادباں، چپّو، سفینہ، ناخدا کہیے مجھے

جانے، کوئی کام کب آ کر مجھے بھی دے نجات

ٹھوکروں میں ایک پتھر راہ کا کہیے مجھے

نہ پوچھ رک گئیں کیوں گردشیں زمانے کی بنے وہ دوست، تو دنیا سے دشمنی کر دی

دردِ دل کی ہو دوا کوئی، یہ ممکن ہی نہیں ہائے عجیب دستِ دعا بھی نہ اٹھایا جائے

کیا کم ہے مری ترکِ تمنا کی تمنا ارمان نہ ہونے کا یہ ارمان بہت ہے

مجھے خبر ہے کہ اتنی خبر نہیں مجھ کو مرے سوا بھی کوئی [illegible] یارو!

نہ جانے توڑ گئے [illegible] کہاں اک دن حصارِ جسم میں جو [illegible] یارو!

زمین پہ رہتا ہے، اڑتا ہے آسمانوں پر ضیا کی پستی بھی [illegible]

ریگزارِ زندگی کی دھوپ ہے جس کو لئے [illegible] جلتی دھوپ میں آیا یہ سایۂ [illegible]

وطن کی یاد ستاتی ہے اب تو غربت میں یہ تم سے کس نے کہا تھا وطن سے [illegible] چلو

نیا زمانہ، نئی روشنی، نئے دستور قدیم رسم و رواجِ کہن سے بھاگ چلو

یہاں تو سانس بھی لینا ہے اے ضیا! مشکل دھواں دھواں ہے فضا، اس گھٹن سے بھاگ چلو

منزل کا تو عرفاں نہیں، اتنی خبر ہے جس سمت سے آیا تھا، اسی سمت چلا ہے

اب بھی جاتا ہے اُسی کوئے وحشت کو نہ پوچھ لاکھ ہم نے دلِ ناداں کو [illegible] دیکھا

سنتے آئے تھے، آج دیکھ لیا بیکسوں کا خدا نہیں ہوتا

اتنے صدمے سہے کہ اب دل کو اعتبارِ وفا نہیں ہوتا

عمر بھر جس پہ جبہہ سائی کی وہ تو پتھر ہوا، خدا نہ ہوا

جگر چھلنی، دلِ پُرخوں، نگاہیں حسرت آلودہ
ہوا یہ دوستی میں، دوستی کے بعد کیا ہوگا

جبینِ شوق کے سجدے دل میں ہے رسوائیِ الفت
تو پھر، اے بندہ پرور! بندگی کے بعد کیا ہوگا

کھو چکا ہوں کبھی کا، یک گچھا میں خود کو ——— ٹوٹ کر مری انا میری دہائی دے ہے

پتّوں کی طرح ٹوٹا، مٹی میں ہوا مٹی ——— شاخوں کی طرح مجھ کو پھلنا نہ نظر آیا

سوتے میں تری یادیں کیا کیا نہ دکھاتی تھیں ——— جب آنکھ کھلی مجھ کو کچھ بھی نہ نظر آیا

ہوئی سحر تو کہاں کھو گیا اجالے میں ——— جو رات بھر میرا دروازہ کھٹکھٹاتا رہا

بہت ملال تھا تنہا روی کا اپنی ضیا ——— کسی کے ساتھ چلا بھی، تو ڈگمگاتا رہا

تمہارے نقشِ پا پر گامزن ہوں ——— مگر یہ راہ جاتی ہے کہاں تک؟

ہے یہی عالم، تو لفظوں کا لباس ——— دل کے ارمانوں کو ہم پہنا چکے

بوڑھا درخت ہوں، مجھے جڑ سے اکھاڑ دو ——— میرا پھٹا ہوا ہے لباس، اور نہ پھاڑ دو

تم تو اہلِ نظر ہو، کہہ دوگے ——— میری کوتاہیاں نظرانداز

شریکِ رنگِ چمن پھول بھی ہے کانٹا بھی ——— کسے یگانہ کہوگے، کسے کہوگے بیگانہ

ڈوبنی ہی تھی یک دن کشتی ——— ناخدا کو سمجھ لیا تھا خدا

جاگئیں کلیوں کی آوارہ خرامی، کچھ نہ پوچھ ——— پانے والے کھو گئے، کیا کھونے والے پا گئے

مرادِ بوئے رنگِ چمن، بہارِ شاخِ گل ——— ہوا، برگِ زرد و خشک، زمیں پر گرا مجھے

نہ ہاتھ جام و دری سے اٹھائے وحشت نے
نہ اپنا چاک گریباں ہوا رفو اب تک

جفا شعاری کا بھی اپنی جائزہ لے لے
ہزار چیں مجھ سے ہے، ناگوار ہے میری خواب تک

پایا جو خود کو، ہم پہ کھلا آدمی کا راز
مدت سے آرزو تھی، کوئی آدمی ملے

ساہتیہ اکاڈمی

ساہتیہ اکاڈمی قومی اہمیت کا ادارہ ہے، جس کی بنیاد بھارت سرکار نے ۱۹۵۴ء میں رکھی تھی۔ یہ ایک خود مختار ادارہ ہے۔

ساہتیہ اکاڈمی کا اہم مقصد ہے، ہندستانی زبانوں کی ادبی ہلچل میں تال میل اور ترقی کرنا، اور ترجموں کے ذریعے کئی ہندستانی زبانوں میں پائے جانے والے عمدہ ادب کو سارے ملک کے پڑھنے والوں تک پہنچانا۔ اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ساہتیہ اکاڈمی نے ایک لمبی چوڑی پبلیکیشن اسکیم ہاتھ میں لی ہے۔

ساہتیہ اکاڈمی کی اہم اردو مطبوعات :

۱۔	ترجمان القرآن۔ مولانا ابوالکلام آزاد (چار جلدیں) فی جلد	22-00
۲۔	خطبات آزاد "	18-00
۳۔	غبار خاطر "	15-00
۴۔	ہیملٹ (ڈراما) شکسپیئر، مترجم فراق گورکھپوری	10.00
۵۔	پریم چند پرکاش چندر گپت، مترجم ل۔ احمد اکبرآبادی	2.50
۶۔	تاریخ بنگلہ ادب سوکمار سین، مترجم شانتی رنجن بھٹاچاریہ	25-00
۷۔	آدم خور (ناول) نانک سنگھ، مترجم پرکاش پنڈت	15-00
۸۔	گورا (ناول) رابندرناتھ ٹیگور، مترجم سجاد ظہیر	10-00
۹۔	کلموہی (ناول) رابندرناتھ ٹیگور، مترجم عابد حسین	7-50
۱۰۔	اپنی کہانی ڈاکٹر راجندر پرشاد، مترجم گوپی ناتھ امن	12.50

ساہتیہ اکاڈمی، رابندر بھون نئی دلی-۱۱۰۰۰۱

نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی مطبوعات

بوند اور سمندر : امرت لال ؛ مترجم : رضیہ سجاد ظہیر

اس ناول کا مرکزی خیال فرد اور سماج کے درمیان تعلق اور رشتہ ہے ، وہ کیا اور کیسا ہونا چاہیے ۔ بوند فرد ہے اور سماج سمندر - آج فرد اور سماج کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے یا جڑا ہے ، اس کو سمجھنے کے لیے اس ناول کا مطالعہ ضروری ہے ۔ قیمت ۲۸/۷۵ روپے

ہندی کے یک بابی ڈرامے : مرتبہ چندر گپت ودیالنکار ؛ مترجم ڈاکٹر محمد حسن

زیر نظر مجموعہ ہندی کے یک بابی ڈراموں کے مختلف اسلوب و انداز پیش کرنے والا اہم انتخاب ہے ۔ اس میں ہندی کے دس جانے پہچانے ڈرامانگاروں کے بہترین ڈرامے شامل ہیں ۔ قیمت ۱۲/۵۰ روپے

میلا آنچل : پھنیشور ناتھ رینو ؛ مترجم : سلمیٰ صدیقی

یہ ہے "میلا آنچل" ، ایک مقامی رنگ لیے ہوئے ۔ اس میں پھول بھی ہیں ، اور کانٹے بھی ؛ دھول بھی ہے اور گلال بھی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار ان میں سے کسی سے بھی دامن بچا کر نہیں نکل پایا ۔ میلا آنچل عالمی ناول کہا جا سکتا ہے ۔ قیمت ۱۸/۷۵ روپے

راگ درباری : شری لال شکلا ؛ مترجم راشد سہسوانی

"راگ درباری" کو ہندی میں بامقصد طنز نگاری کی شروعات کہا گیا ہے ۔ یہ کسی طرح بھی کلاسیکی ناول سے کم نہیں ہے ۔ مختلف طرز کے پلاٹ ، ایک نئی ٹکنک اور زبان و بیان کی خوبیوں سے بھرپور ناول قیمت ۱۵/۵۰ روپے

تقسیم کار :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ جامعہ نگر ، نئی دلی ۲۵